ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! ساون کی رم جھم اور گزشتہ عید کی خوشیوں میں اللہ کرے آپ سب اپنے متعلقین سمیت بخیریت ہوں۔ گرمی کا زور ٹوٹ رہا ہے اور صبح وشام کی خوشگواری دھیرے دھیرے لوٹ رہی ہے۔ البتہ عید کے تین روز پورے ہونے کے بعد لوڈ شیڈنگ اسی شدت سے جاری وساری ہوگئی ہے کہ مبادا ہم اپنی ''اوقات'' بھول جائیں۔ اور اب تو موسم بدلتے ہی گیس کے تیور بھی بدل جائیں گے۔ گرمیوں کے اپنے وبال اور سردیوں کے اپنے عذاب! (وصل کے اپنے دکھ سہی، دردِ فراق اور ہے!) ہر حال میں اللہ کا شکر ہی مسائل کا حل ہے۔

سانحہ گلگت میں بے گناہوں کا قتل اس ماہ کا سب سے دلخراش اور خطرناک سانحہ ہے۔ دہشت گردی کا شکار تو ہم لوگ کئی سالوں سے اور کئی انداز میں ہیں مگر یہ انداز سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے کہ خالص دہشت گردی کی کارروائی کو فرقہ وارانہ فسادات بنا کر پیش کیا جائے۔ پاکستان میں فرقہ واریت کے نام پر وقتاً فوقتاً جتنے بھی پرتشدد واقعات ہوئے ہیں۔ ان میں بیرونی ایجنسیوں کا ہاتھ ثابت ہوا ہے مگر کبھی بھی تحقیقات کی تفصیل منظر عام پر نہیں لائی گئی۔ میڈیا ایسے واقعات کو فرقہ واریت کہہ کر رواداری اور برداشت کا درس دینے لگتا ہے اور مذہبی حلقوں کو ذمہ دار قرار دے دیتا ہے۔ بقول منظر بھوپالی ؎

یہاں گناہ ہوا کے چھپائے جاتے ہیں
چراغ خود نہیں بجھتے بجھائے جاتے ہیں
یہ کیسا قرض ہے نفرت کا کم نہیں ہوتا
کہ بڑھتا جاتا ہے جتنا چکائے جاتے ہیں

اسی طرح اقلیتوں کے حقوق کا بھی شور بلند کیا جاتا ہے اور پرتشدد واقعات کروا کر اسی تاثر کو ہوا دی جاتی ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ سندھ سے ہندوؤں کی ہجرت بھی ایسے ہی اقدامات کا شاخسانہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کو کمزور کرنے کی وہ تمام کوششیں جو نو گیارہ کے بعد سے نہایت سرعت سے اور مختلف پہلوؤں سے جاری تھیں، اب انہیں نتیجہ خیز بنانے اور مرتکز کرنے کی طرف کام ہو رہا ہے۔ حکومتی ایوانوں، اہل سیاست، ریاستی اداروں اور ذرائع ابلاغ میں ہر طرف بکاؤ مال چہرے ہیں جو ان ناپاک منصوبوں کا علم ہوتے ہوئے بھی انجان بنے ہوئے ہیں۔ جب تک عوام خود اپنی تقدیر کے مالک نہیں بنیں گے پاکستان کو بچانے کی کوششیں کارگر نہیں ہوں گی۔

کامرہ ایئربیس پر حملہ ایک اور سانحہ ہے۔ جی ایچ کیو راولپنڈی اور پی این ایس مہران کے بعد یہ تیسرا دہشت گرد حملہ ہے جو اپنے انداز میں بالکل علامتی تھا اور یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ پاکستان کے قیمتی اثاثے کتنی آسانی سے کسی کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔ دکھ اس بات پر ہے کہ پچھلے دونوں واقعات کی طرح اس کی تحقیقات بھی دبا دی جائیں گی اور اصل مجرم کبھی سامنے نہیں آئیں گے۔

میڈیا پر فحاشی وعریانی کی روک تھام کے لئے پیمرا کیخلاف دائر کیے گئے کیس کی سماعت بھی گزشتہ دنوں ہوئی۔ الیکٹرانک میڈیا پر فحش وعریاں پروگراموں اور اشتہارات نے آجکل ذوق سلیم رکھنے والے ہر سنجیدہ اور باشعور شہری کو پریشان کر رکھا ہے۔ بچوں کی تربیت کے لئے حساس والدین اس بڑھتے ہوئے چیلنج کے آگے بے بس ہوتے جارہے ہیں۔ ''آزادیِ انتخاب'' کے علمبردار لوگ تو مزے سے کہہ دیتے ہیں کہ دیگر اچھے چینل بھی تو موجود ہیں، آپ خراب چینل نہ لگائیں۔ مگر کیا یہ نسخہ بچوں اور ٹین ایجرز پر بھی کارگر ہوسکتا ہے جنہیں آپ لاکھ اچھے برے کی تمیز سکھائیں مگر برائی کی دلکشی انہیں فوراً اپنی طرف کھینچتی ہے؟ اور پھر جہاں خبریں سننا اور دیکھنا بھی محال ہو جائے کہ وہاں بھی ''انٹرٹینمنٹ نیوز'' کے نام پر ننگے ناچتے جسم اور شرمناک بولوں والے گانے مسلط کر دیے جاتے ہوں اور وقفوں میں بھارتی عریاں ماڈلز کے اشتہارات بار بار ''ذوق سلیم کی آبیاری'' کرتے ہوں وہاں آزادیِ انتخاب کے کوئی معنی رہ جاتے ہیں؟ مانا کہ میڈیا صنعت بن چکا ہے اور صارفین ڈیمانڈ پر چلتا ہے، لیکن اگر فحاشی وعریانی کی متفقہ تعریف کی ضرورت ہے تو اس صنعت میں ڈیمانڈ کی بھی تشریح کی ضرورت ہے۔ کیا سنسنی خیزی، سستے جذبات کو ابھارنا، شر کو فروغ دینا، نفسیاتی تسکین کو زندگی کا مقصد بنا کر پیش کرنا، اعلیٰ انسانی اقدار کو فراموش کر دینا، یہ سب صارفین کی ڈیمانڈ کہا جاسکتا ہے؟ اور پھر کیا محض ڈیمانڈ کے نام پر فرض کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے معاشرتی سیٹ اپ میں بھی وہی پروگرام مناسب ہیں جو بھارتی اور مغربی مشرکانہ اور سیکولر معاشروں کے لئے بنے ہیں؟

اگر محض پروگراموں کی ریٹنگ بڑھنے کی بنیاد پر یہ فیصلے ہوتے ہیں تو ریٹنگ جہاں فحش پروگراموں کی بڑھتی ہیں، وہیں انہی چینلوں پر کسی اچھے اور معیاری ڈرامے اور ٹاک شوز کی ریٹنگ بھی تو بے حد بڑھ جاتی ہے۔ جب تک باقاعدہ سائنسی بنیادوں پر رائے عامہ لینے کا اہتمام نہ کیا جائے، ڈیمانڈ کے بارے میں یکطرفہ فیصلہ آخر کیسے صادر کیا جاسکتا ہے اور پھر ایک مسلم معاشرے میں میڈیا کا اصل کام فحاشی پھیلانے کی بجائے رائے عامہ کی تربیت کرنا اور لوگوں میں یہ ذوق پیدا کرنا ہے کہ وہ پاکیزہ پروگراموں کی طرف مائل ہوں اور فحش پروگراموں سے نفرت کرنے لگیں۔ خدا خوفی کا یہی تقاضا ہے جیسا کہ سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔''

پیمرا کی جانب سے صارفین کی ڈیمانڈ کے اس بہانے کو غیر مؤثر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کا وہ کثیر اور باشعور حصہ فعال ہو، جو میڈیا کے ذریعے صاف ستھری تفریح کی شدید ڈیمانڈ رکھتا ہے اور جس کی یہ بھی بھرپور ڈیمانڈ ہے کہ لچر اور فحش بھارتی شوز، ڈرامے اور اشتہارات ہمارے چینلوں سے بند کیے جائیں۔ ایسے لوگ ہر سطح پر آواز میں آواز ملا کر پیمرا کے خلاف عوام کے اس کیس کو مضبوط بنائیں تاکہ ہم اس ''صنعتی منافع'' کے ہاتھوں ''قومے فروختند'' کی صورتحال سے بچیں۔

4 ستمبر عالمی یوم حجاب ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ حجاب کا شعور مسلم خواتین میں بالعموم روز افزوں ہے اور اسے بنیادی انسانی حقوق اور آزادیِ انتخاب کے پہلو سے دیکھا اور مانگا جانے لگا ہے۔ یہ بے حیائی کا فطری ردعمل بھی ہے اور دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمان خواتین کے اس حق کو تسلیم نہ کرنے کا جواب بھی۔

معروف ومقبول شاعر شہزاد احمد انتقال کر گئے۔ جدید شاعری کے رجحان ساز شاعر اور کئی مجموعہ ہائے کلام کے خالق تھے۔ گہری بات اور سادہ زبان ان کی شاعری کی پہچان تھی۔ اردو شعر وادب کا افق ایک اور روشن ستارے سے محروم ہوا۔ اللہ جنت نصیب کرے آمین۔

دعا گو

صائمہ اسما

دُعا

دعا کا مفہوم

دعا کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ جو اسباب، وسائل اور اختیارات اسے حاصل ہیں وہ اس کی حاجت پوری کرنے یا اس کی تکلیف کو رفع کرنے کے لیے ناکافی ہیں تو وہ کسی ایسی ہستی کی تلاش کرتا ہے جو فوق الفطری (Supernatural) طریقے سے اس کی حاجت پوری کر سکتی ہو۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہستی سمیع و بصیر ہو، عالم الغیب ہو، رحیم و کریم ہو، تمام وسائل پر اس کا قتدار ہو، تمام خزانوں کی مالک ہو، کوئی اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے روک نہ سکتا ہو۔ پوری کائنات میں ایسی ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اس لیے دعا صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیے۔ اس کے علاوہ کسی اور سے مانگنا شرک ہے۔ کفار و مشرکین بھی جب کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تو ایک خدائے واحد ہی کو مدد کے لیے پکارتے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ بات اس طرح کہی گئی ہے۔

''وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے، چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔'' (سورۂ یونس۔۲۲)

''جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک اللہ کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب تم سے گم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔'' (سورۂ بنی اسرائیل۔۶۸)

''ان سے کہو، ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آ جاتی ہے یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو۔ پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو۔'' (سورۃ الانعام۔۱۴۰-۱۴۱)

عکرمہ بن ابوجہل

جب انسان پر کوئی بڑی آفت آ جاتی ہے یا موت اپنی بھیانک صورت کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوتی ہے تو اس وقت ایک خدا کے دامن کے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ اُسے نظر نہیں آتی۔ بڑے سے بڑے مشرک بھی ایسے موقع پر اپنے معبودوں کو بھول کر خدائے واحد کو پکارنے لگتے ہیں، ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو اسی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی۔

جب مکہ معظّمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر فتح ہو گیا تو عکرمہ اس خوف سے کہ انھیں قتل کر دیا جائے گا، جدہ کی طرف بھاگے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر یمن کی راہ لی۔ راستے میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرہ میں پڑ گئی۔ اول اول تو دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا مگر جب طوفان کی شدت بڑھی تو سب نے کہا یہ وقت ایک اللہ کے سوا کسی اور کو پکارنے کا نہیں، وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں۔ اس وقت عکرمہ کی آنکھیں مجھی اور ان کے دل نے آواز دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی اور مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو؟ یہی تو وہ بات ہے جو اللہ کا وہ نیک بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں بیس برس سے سمجھا رہا ہے اور ہم خواہ مخواہ اس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عکرمہ کی زندگی میں فیصلہ کن لمحہ تھا۔ انھوں نے اسی وقت اللہ سے عہد کیا کہ اگر میں اس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا اور بعد میں آ کر نا صرف مسلمان ہوئے بلکہ اپنی بقیہ عمر اسلام کے لیے جہاد کرتے گزار دی اور شہادت کا رتبہ پایا۔

کمیونسٹ روس

دوسری جنگ عظیم ۱۹۴۵ء کا یہ واقعہ ہے کہ جرمنی نے کمیونسٹ روس پر بھرپور حملہ کر دیا اور روس کا دارالحکومت ماسکو خطرے میں پڑ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہٹلر کی فوجیں چند دنوں میں ماسکو میں داخل ہو جائیں گی۔ تو اس وقت روس کے حکمران سٹالن نے تمام مسجدیں، گرجے اور دوسری عبادت گاہیں جو پہلے بند کر دی گئی تھیں، کھلوا دیں اور لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے خدا سے دعا مانگیں کہ جرمنوں کی اس یلغار سے وہ انھیں بچائے۔ (یہ بات ذہن میں رہے کہ کمیونزم کے نظریے کی بنیاد ہی اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار پر ہے)۔

صرف اللہ ہی حاجت روا ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے، اور کس نے تمھیں زمین میں خلافت عطا کی ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی الٰہ ہے جو یہ کام کرنے والا ہے؟ تم لوگ کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔'' (سورۃ النمل۔۶۲)

''لوگو تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو غنی و حمید ہے۔''

(سورۂ فاطر۔۱۹)

''اور اے نبیؐ، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے

والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی دعا سنتا ہوں اور اس کا جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ یہ بات انھیں سنا دو، شاید کہ وہ راہ راست پالیں۔'' (سورۃ البقرہ۔۱۸۶)

بندے اور رب کا رشتہ

دعا بندے اور اس کے رب کے درمیان پائے جانے والے رشتے کی بہترین ترجمان ہے۔ اس میں بندے اور رب کے درمیان مناجات اور راز و نیاز کی کیفیت دیکھی جاسکتی ہے اور جہاں یہ بندے کی قوت کا سرچشمہ اور آفات سماوی وارضی کے مقابلے کے لیے اس کا سہارا ہے، وہیں اگر قرآن وسنت میں تعلیم کردہ دعاؤں پر ایک خاص پہلو سے غور کیا جائے تو دعاؤں کے اس مرقع میں اسلام کے تصور حیات اور اس نظام زندگی کے فریم ورک میں انسان کے لیے ترجیحات، مطلوبہ سیرت کے خدوخال اور سعی وعمل کے اہداف کی ایک ایسی جامع اور حسین تصویر سامنے آتی ہے کہ انسان کا دل بے اختیار گواہی دیتا ہے کہ یہ بھی ہدایت ربانی کا ایک معجزہ ہے۔

دعا کا محرک بندے کا یہ احساس اور یقین ہے کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کا ایک خالق، آقا اور رب ہے جس سے جڑ کر ہی وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرسکتا ہے۔ یہ رب سے تعلق ہی ہے جو زندگی کو معنی سے معمور اور مقصد سے سرشار کرتا ہے۔ ورنہ انسان ایک کٹی ہوئی پتنگ کی مانند ہے جس کا کوئی سہارا نہیں۔ دعا اللہ سے رشتہ استوار کرنے اور ہر لمحے اسے قائم کرنے کی ایک کوشش اور ذریعہ ہے۔ دعا کرنے والا بندہ ہر وقت اپنے رب کے حضور میں حاضر رہتا ہے اور اس کی توفیق اور استعانت کے سہارے زندگی کے سارے مراحل طے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ سے یہ تعلق محض لفظی یا قانونی تعلق نہیں، یہ گہرا ذاتی ربط وتعلق ہے اور اس کے ذریعے بندہ اپنے معبود سے ایک ایسے رشتے سے جڑ جاتا ہے جو کسی لمحے کمزور نہیں ہوسکتا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعائیں تعلیم فرمائی ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دعاؤں سے اپنے رب سے اپنے تعلق کو استوار کیا ہے، وہ دراصل اللہ کے ہر بندے اور بندی کے لیے تزکیہ اور تربیت کا ایک کورس ہیں۔ ان پر تدبر کی نگاہ ڈال کر بندہ ان تمام بنیادوں کو سمجھ سکتا ہے جن پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کو قائم ہونا چاہیے اور انھی میں یہ تعلیم بھی ہے کہ بندے کی آرزوئیں اور خواہشات کیا ہونی چاہییں۔ جن باتوں کا رب سے مانگنے کا ہمیں درس دیا جا رہا ہے وہ دراصل ہماری آرزوؤں، خواہشات اور ترجیحات کی تعلیم وتہذیب ہے۔ یہ ایک مومن کی زندگی کے اہداف اور اس کی ترجیحات ہیں جن کا بیان ان دعاؤں میں ہوا ہے۔ یہ کوئی نظری اور تصوراتی شے نہیں، یہ تو مجموعہ ہیں ایک مسلمان کی تمناؤں اور خواہشات کا اور یہ صرف الہامی ہدایت اور تعلیم نبویؐ ہی کا اعجاز ہے کہ وہ صرف قانون، ضابطہ، بیرونی نظام یا عقلی محمولات تک اپنی اصلاح وتعلیم کو محدود نہیں رکھتا بلکہ وہ انسان کی آرزوؤں اور تمناؤں، اس کے دل کی کیفیات اور نفس کی خواہشات تک کی تہذیب وتزئین بھی کرتا ہے تاکہ بندے کا ارادہ، اپنے رب کے ارادے سے مکمل

طور پر ہم آہنگ ہو جائے۔ اس کے اندر ایک متوازن شخصیت رونما ہو، یک رنگی اور یکسوئی سے اس کی پوری زندگی عبارت ہو اور اس طرح وہ خود اپنی فطرت، اس کائنات اور اپنے رب کی رضا سے ہم آہنگ ہو جائے۔

دعا کا سب سے اہم پہلو رب سے تعلق ہے۔ جتنا یہ تعلق گہرا ہوگا اتنا ہی انسان کے قدم مضبوط ہوں گے۔ اسلامی تصور حیات کا امتیازی پہلو اس حقیقت کو دو اور دو چار کی طرح واضح کر دینا ہے کہ رب، رب ہے اور بندہ، بندہ اور ان کے درمیان رشتہ، رشتہ عبودیت ہے۔ انسان کی معراج بندگی میں ہے، خدائی کی نقالی میں نہیں۔ رب ایک اور صرف ایک ہے جو خالق، مالک، آقا اور قادر مطلق ہے..... باقی سب مخلوق ہے۔ رب کے علاوہ کسی کو خدائی کا کوئی ادنیٰ سا بھی اختیار حاصل نہیں۔ تمام انسان اللہ کی مخلوق ہیں اور باہم مساوی اور برابر .....ایک ہی قانون کے تابع! ایک ہی حاکم کی رعیت! انسان پر سے انسان کی حاکمیت اور خدائی کو ختم کر کے اور صرف ایک خدا کے سامنے جواب دہ کر کے اسلام نے انسان کو حقیقی آزادی اور عزت نفس سے روشناس کیا۔ (**اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ**۔ اے رب، ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ الفاتحہ ۱:۴) یہ آیت کریمہ دعا کی اساس اور بنیاد اور بندوں سے بے نیاز اور صرف اللہ کا دامن تھامنے والے انسان کے لیے آزادی اور شرف کا اعلیٰ ترین چارٹر ہے۔

رب سے تعلق، اس پر اعتماد اور بھروسا، اس سے مناجات اور التجا، اس کے دامن کو تھامنا اور اس سے مانگنا، تقویٰ کا راستہ ہے۔ ماثور دعاؤں میں سب سے اہم اور نمایاں چیز یہی تعلق باللہ ہے۔ رب کے آگے عاجزی اور درماندگی ہی وہ راستہ ہے جس سے بندہ رب سے قریب ہوتا ہے، روحانی بلندیوں اور رفعتوں کو چھو سکتا ہے، اور رب کے الطاف و اکرام کا مستحق بنتا ہے۔ کسی انسان یا کسی دوسری مخلوق کے آگے جھکنا اور ہاتھ پھیلانا، شرک کی ایک شکل ہے۔ انسان کے لیے جائز صرف اپنے رب کے آگے ہاتھ پھیلانا اور اس سے مدد اور استعانت طلب کرنا ہے۔ اللہ کے وفادار بندوں کا یہی طریقہ اور وطیرہ ہے۔ صبح و شام، اٹھتے بیٹھتے، کام کرتے یا آرام کرتے، نیند یا بیداری، ہر حالت میں وہ صرف اپنے رب کو پکارتے ہیں اور جو بھی مانگتے ہیں..... بڑی سے بڑی چیز سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی چیز تک..... وہ صرف اپنے رب ہی سے مانگتے ہیں اور ہر نعمت پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس طرح دعا دراصل وہ طرزِ زندگی ہے جس میں بندہ ہر دم اپنے مالک سے جڑا رہتا ہے جس طرح اللہ ہر لمحے انسان کے ساتھ ہے۔ '**وَهُوَ مَعَكُمۡ اَيۡنَ مَا كُنۡتُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ**' (الحدید ۵۷:۴) ''وہ اللہ تمھارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس کی نظروں میں ہے۔'' اسی طرح دعا اور ذکر کے ذریعے بندہ بھی شعوری طور پر مسلسل رب کی معیت میں رہتا ہے۔

☆ دعا عبادت ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''تمھارا رب کہتا ہے، مجھے پکارو، میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا۔ جولوگ گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ ضرور ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''(سورۃ المومن۔۶۰)

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''دعا عین عبادت ہے۔'' اس کے بعد آپ نے سند کے طور پر یہی آیت پڑھی۔(**وقال ربکم ادعونی ..... الخ**)جس کا ترجمہ اوپر دیا گیا ہے۔(ترمذی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''دعا عبادت کا مغز(اور جوہر) ہے۔''(ترمذی)

ان احادیث اور اس آیت میں دعا کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ میں نے انسانوں اور جنوں کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ انسانوں اور جنوں کے لیے اس کائنات میں بلند ترین مقام عبدیت کا ہے اور سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام کے امام یعنی اس وصف خاص میں سب پر فائق ہیں، عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی بندگی وغلامی، اطاعت وفرمانبرداری اور پوجا و پرستش سبھی شامل ہیں۔ اور دعا عبادت کا اہم جزو ہے۔ لفظ الصلوٰۃ یعنی نماز کا مطلب ہی دعا ہے۔

<u>اللہ تعالیٰ نے ہمیں خود دعائیں سکھا دیں</u>

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی دعائیں جو اس کی دنیا اور آخرت کی بھلائی کے لیے بہت اہم ہیں قرآن میں ہمیں سکھا دیں۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بھی ہمیں سینکڑوں دعاؤں کی تعلیم دی۔ یعنی کائنات کا سب سے بڑا بادشاہ اپنے سائل بندوں کو یہ بتا رہا ہے کہ ان الفاظ میں عرضی لکھ کر لاؤ، قبول ہوگی۔ اس سے تین باتیں اخذ کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ اللہ اپنے بندوں پر بے حد رحیم وشفیق ہے، ان کے مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے۔

۲۔ وہ ہم سے بہتر جانتا ہے کہ ہمیں اس سے کیا مانگنا چاہیے۔

۳۔ اس کا پروگرام اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرنے کا ہے رد کرنے کا نہیں۔

بندوں کو دعائیں سکھانے کا یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ پہلی دعا جو کسی انسان نے اللہ سے مانگی وہ اللہ نے ہی آدمؑ کو سکھائی تھی۔ آدمؑ کا معاملہ بہت دلچسپ تھا۔ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود تھا۔ آدمؑ اور حوا کے کوئی ماں باپ نہیں تھے جن سے وہ زبان سیکھ لیتے۔ روزمرہ ضرورت کے کچھ الفاظ اور نام اللہ تعالیٰ نے خود ان کو سکھا دیے تھے۔ جب ان سے ایک قصور سرزد ہوا تو دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے اس قصور کی معافی مانگنا چاہتے تھے لیکن اس کے الفاظ ان کو معلوم نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی یہ مشکل حل کر دی اور پہلی انسانی دعا کے الفاظ بھی ان کو سکھا دیے جو ہم بھی پڑھتے ہیں اور قیامت تک پڑھی

جائے گی۔ **'ربنا ظلمنا انفسنا وان الم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخٰسرین'**۔ اس کے بعد سبھی انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے دعائیں سکھائیں جن میں سے بہت سی قرآن میں درج ہیں۔

دعا اور ذکر الٰہی

قرآنی دعاؤں کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمیں بہت سی دعاؤں کی تعلیم دی ہے۔ ان میں سے اکثر دعاؤں کا تعلق ہمارے ان روزمرہ کے معمولات سے ہے جن میں ہم چوبیس گھنٹے مصروف رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر صبح نیند سے بیدار ہونے کی دعا، بیت الخلا میں داخل ہونے کی دعا، بیت الخلا سے باہر آنے کی دعا، وضو کرنے سے پہلے اور وضو کے بعد کی دعائیں۔ لباس پہننے کی دعا، آئینہ دیکھنے کی دعا، اذان کے بعد کی دعا، گھر سے باہر نکلنے اور گھر واپس آنے کی دعا، سواری پر سوار ہونے اور اترنے کی دعائیں۔ کسی سے ملاقات ہونے پر سلام، سفر پر روانہ ہونے کی دعا، سفر سے واپس گھر پہنچنے کی دعا۔ کسی کو سفر پر روانہ کرنے کی دعا۔ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد کی دعائیں۔ مسجد میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کی دعائیں۔ فرض نماز کے بعد کے اذکار۔ سورج غروب ہونے کی دعا۔ رات کو بستر پر لیٹ کر سونے سے پہلے کی دعا اور اذکار۔ کوئی کام شروع کرتے وقت بسم اللہ کہنا، کوئی آرام پہنچے یا تکلیف دور ہونے پر الحمدللہ اور دوسرے شکر کے کلمات کہنا۔ کوئی صدمہ پہنچنے پر انا للہ پڑھنا۔ کوئی اچھی چیز دیکھ کر سبحان اللہ، اللہ اکبر کہنا وغیرہ وغیرہ۔ (جاری ہے)

حوالہ جات: تفہیم القرآن، مشکوٰۃ شریف، معارف الحدیث، صیام رمضان و حج بیت اللہ، حب الٰہی (بنت الاسلام)، زندگی کی ترجیحات (پروفیسر خورشید احمد)۔ قرآنی اور مسنون دعائیں، (سید شبیر احمد)۔

☆☆☆

دن گزرتے جارہے ہیں لیکن برما سے آنے والی خبروں کی سنگینی کم ہونے میں نہیں آ رہی۔ وہاں کی یک طرفہ قتل و غارت گری، مال اور عزتوں کی بربادی، شعائر اسلامی کی پامالی پر ''عالمی برادری'' اگر خاموش ہے تو اس سے اس کے علاوہ اور توقع بھی کیا تھی..... رونا یہ ہے کہ اسلامی برادری پر بھی سکوتِ

ڈاکٹر آسیہ شبیر منصوری

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

آہ برما کے مسلمان

اب معاملات میزوں پر ٹھنڈے کمروں میں اور کانفرنسوں میں طے پاتے ہیں۔ ظالموں کا ہاتھ پکڑنا اور کلائی مروڑ دینا پرانے وقتوں کے نعرے ہیں

مرگ طاری ہے۔

برما، روہنگیا اور اراکان کے الفاظ ہمارے لیے پہلے بھی نئے نہیں تھے، لیکن ذاتی تعلق کسی معاملے میں احساس کی شدت پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے..... یہ اب محسوس ہو رہا ہے۔

☆☆☆

یہ نومبر ۲۰۱۰ء کے موسم حج کی بات ہے..... جب ذی الحج شروع ہو چکا تھا اور مسجد حرام اپنی وسعت کے باوجود تنگ محسوس ہونے لگی تھی۔ نیچے کی منزلیں بھر جاتیں تو دروازوں پر کھڑے خدام لوگوں کو چھت کی طرف روانہ کرتے .....عصر سے پہلے ہی ہم مستقل وہیں چلے جاتے۔ اگرچہ شروع میں تھوڑی گرمی محسوس ہوتی .....لیکن تھوڑی دیر بعد ہی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں اور مغرب تک چھت پر بھی کھوے سے کھوا چھلنے لگتا۔

دیس دیس کے لوگ، کالے، گورے، شرق وغرب سے آئے، مختلف زبانیں بولنے اور مختلف لباس پہننے والے..... جب صفوں میں ساتھ کھڑے ہو جاتے تو یہ منظر اپنی ساری دلکشی کے باوجود ایک عجیب سی کسک دل میں چھوڑ جاتا۔ یہ اتنی منظم صفیں .....اللہ اکبر کے نعرے پر اٹھتی بیٹھتی، دائیں بائیں چہرے موڑتی، یہ تو ایک فوج ہے۔ نماز ختم ہو جاتی اور صفیں منتشر.....لیکن کتنی دیر خیال وہیں اٹکا رہتا کہ کبھی ایک دفعہ یہ سارے لوگ اکٹھے ہی اٹھ کھڑے ہوں، اور پھر ہر اس سرزمین کا رخ کریں جہاں مسلمان مشکل میں ہیں.....وہاں جا کر یہ کچھ بھی نہ کریں، بس ایک مرتبہ زور کا نعرۂ تکبیر ہی بلند کر دیں .....صرف اسی سے ظالموں کا پتہ پانی نہ ہو جائے.....کم از کم میں تو ہر روز سوچتی رہی کہ کیا یہ عظیم اجتماعی عبادتِ حج محض کچھ مراسم اور مناسک کے ادا کرنے کے بعد بس بکھر جانے کے لیے ہے۔

ان احساسات کو مہمیز کچھ ان ملاقاتوں سے بھی ملتی تھی جو مختلف خطوں سے آئے ہوئے لوگوں کے ساتھ ہو جاتی تھی۔ انھیں ملاقاتوں میں سے ایک میرے برما سے براہ راست تعارف کا ذریعہ بنی۔ درمیانے قد کی بنگالی نقش ونگار کی وہ برمی خاتون اسی دن مکہ پہنچی تھی اور نماز عصر میں میرے بائیں جانب تسبیح ومناجات میں مصروف تھی۔ جب تعارف ہوا تو میں نے اپنی سابقہ محدود معلومات کی روشنی میں برما کے حالات پوچھے ..... وہ اردو بول رہی تھی ..... بہت رواں نہیں .....لیکن اچھی

خاصی بول لیتی تھی۔

چشم تصور میں ..... میں آج بھی اس کرب واضطراب کو گویا دیکھ رہی ہوں جوان لمحوں میں اس کے چہرے پر محسوس کیا تھا ..... جو کچھ میں نے پوچھا، مجھے لگا کہ وہ مجھے جواب نہیں دے رہی ..... رب العرش سے فریاد کناں ہے۔ گریہ، نالہ، فریاد، فغاں ..... وہ کیا کیفیات تھیں، الفاظ میں ان کا بیان ناممکن ہے۔ جان، مال اور عزتوں کی بربادی کی داستانیں پڑھنا اور بات ہے، جن پر بیت رہی ہو ان کو دیکھنا اور ان سے سننا اور ..... وہ بتاتی رہی ان فسادات کے بارے میں، جو کبھی محض اذان دینے پر بھڑک اٹھتے ہیں اور کبھی ذبیحہ کرنے پر، اور کبھی بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے پر ..... مسجدیں بند اور ویران ہیں ..... قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ چھوٹی سی بات پر شروع ہوتا ہے اور مہینوں تھمنے میں نہیں آتا۔ بالکل ساتھ بیٹھے ہم بات کر رہے تھے کہ اس کا بیٹا آ گیا۔ بے اختیار میں نے بھی مڑ کر دیکھا (گو ایک نظر) یہ عورتوں کی صفوں کے درمیان مردانہ آواز کہاں سے آئی ..... تو اس نے مجھے سلام کر دیا۔ وہ اپنی ماں سے کچھ کہنے آیا تھا ..... اونچا لمبا، چوڑا چکلا نوجوان ..... تھوڑی سی بات کر کے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد مغرب کی اذان ہوئی اور نماز کے بعد وہ خاتون بھی اٹھ کر کہیں اور چلی گئیں۔

آج، جب برما سے طرح طرح کی خبریں آ رہی ہیں تو میری نظر کے سامنے سے وہ ماں بیٹا ہٹتے ہی نہیں ..... خبریں ہیں بھی عجیب، نہ کوئی گھروں میں محفوظ ہے، نہ کیمپوں میں ..... نہ فرار کا کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی جائے پناہ ..... شاعر عجیب ہولناک شعر لکھتے ہیں اور امت مسلمہ کی ماؤں کے حالات پر وہ منطبق ہوتے جاتے ہیں ..... ۔

کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں

سے

اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

☆☆☆

برما جنوب مشرقی ایشیا کا ملک ہے جس کی آبادی تقریباً سات کروڑ ہے۔ برمی باشندوں کی اکثریت بدھ مت کی پیرو ہے۔ پچاسی فیصد بدھوں کے علاوہ باقی آبادی مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کی آبادی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق چار فیصد ہے اور مسلمانوں کے خیال میں اس سے زیادہ ہے۔ برما کی مسلم آبادی کا تقریباً نصف حصہ اراکان کے صوبے میں آباد ہے جو آج مقتل بنا ہوا ہے۔ اسلام یہاں عرب تاجروں کے ذریعے پہنچا تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں بعض روایات کے مطابق اس صوبے میں ایک خوشحال اور خودمختار مسلم سلطنت قائم ہوئی تو وارد گرد کے مسلمان بھی یہاں آ کر بسنے لگے۔ دو تین صدیاں ایسے گزریں کہ درمیان میں اگر بدھ حکمران بھی آئے تو اکثریتی مسلمانوں کے ساتھ ان کا سلوک بہت اچھا رہا۔ ۱۷۸۴ء میں برما نے اراکان پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنا ایک صوبہ قرار دے دیا۔ دوسری طرف انگریز برصغیر میں بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں انگریزوں نے پورے برما پر قبضہ کر کے اسے ہندوستان کا صوبہ بنا لیا۔

انیس سو سنتالیس میں پاکستان اور بھارت کو آزادی ملی اور انیس سو اڑتالیس میں انگریزوں نے برما کو بھی آزاد کر دیا۔ اراکان کی ریاست اس ''آزادی'' میں دولخت ہوگئی۔ اس کا کچھ حصہ بنگلہ دیش، سابقہ مشرقی پاکستان میں شامل کر دیا گیا تھا ..... بڑا حصہ برما کو دے دیا گیا اور یوں انگریزی استعمار نے جاتے جاتے برما میں ایک مستقل فساد کی بنیاد رکھ دی ۔ پاکستان و ہندوستان کے درمیان اس طرح کا ایک ناسور کشمیر کی صورت میں چھوڑا گیا تھا اور مشرق وسطیٰ میں فلسطین کی صورت ..... بعدازاں پاکستان سے بنگلہ دیش بھی فساد پر مبنی اسی تقسیم کی وجہ سے الگ ہوا تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان خشکی کا راستہ ہندوستان کے حوالے کر دیا گیا تھا اور ایک ملک کے دو حصے دیگر سازشوں کے علاوہ، زمینی فاصلے کی بھی نذر ہو گئے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں جب سے اراکان پر برما کا قبضہ ہوا، یہاں کے مسلمان متعصب بدھوں کے ہاتھوں کبھی چین سے نہ رہ سکے ..... تاہم برما کی آزادی کے بعد تو ان پر عرصۂ حیات مزید تنگ ہوتا گیا۔ مسلمانوں کو اپنی مذہبی شناخت پر اصرار رہا اور دوسری طرح حکمران انھیں زبردستی بدھ مت قبول کرنے پر مجبور کرتے رہے۔ یوں ''اسلام'' ان کا واحد قصور ہے جس پر یہ کئی عشروں سے نشانۂ تعذیب بنے ہوئے ہیں۔

وما نقموا منهم الا ان يومنوا بالله العزيز الحميد ۔ (البروج:۸)

ان سے اس کے سوا کسی بات کا انتقام نہیں لیا جا رہا کہ وہ اللہ پر ایمان لے آئے ہیں جو زبردست اور قابل تعریف ہے۔

۱۹۸۴ء میں برما کی حکومت نے شہریت کا نیا قانون نافذ کیا جس کی رو سے روہنگیا مسلمان برما کے شہری نہیں ہیں۔ اس قانون کی رو سے مسلمانوں کے اندرون ملک اور بیرون ملک نقل وحرکت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ وہ آزادی سے ایک بستی سے دوسری بستی بھی نہیں جا سکتے۔ تیس سے چالیس لاکھ ان مسلمانوں پر سرکاری ہی نہیں۔ پرائیویٹ ملازمتوں کے دروازے بھی بند ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کی جبری ملک بدری کی کوشش بھی جاری رہتی ہیں جو نکل پائے وہ زیادہ تر عرب ریاستوں، پاکستان، بنگلہ دیش اور املائشیا میں بس گئے۔

برما کے ان مسلمانوں کا مساجد اور مدارس کا اپنا نظام تھا۔ مجھے خود یاد ہے جب آج سے بارہ چودہ سال پہلے ایک برمی مسلمان رمضان المبارک میں مسجد اور مدرسے کے لیے چندہ لینے پنجاب یونیورسٹی کی مسجد میں آیا تھا۔ یہ لوگ بنگلہ دیش کے راستے پاکستان آتے جاتے تھے۔ بعد میں بنگلہ دیش نے ''سرحدی نگرانی'' سخت کر دی اور برمی حکومت بھی مدارس اور مساجد کا گھیرا مزید تنگ کرتی گئی۔

☆☆☆

تازہ قیامت جو برما کے مسلمانوں پر ٹوٹی ..... وہ مئی میں دو بدھ خواتین کے قبول اسلام کے ردعمل کے طور پر تھی۔ متشدد بدھوؤں نے ان خواتین کو قتل کر کے، مسلمانوں پر ان کی بے حرمتی اور قتل کا الزام عائد کیا اور پھر مسلم کش فسادات کا سلسلہ

شروع ہوگیا۔

نوائے وقت کے مطابق پہلا حملہ ایک بس پر ہوا جس میں تبلیغی جماعت کے دس کارکنوں کو بس سے اتار کر شہید کیا گیا۔ اس کے بعد فوج اور پولیس کی نگرانی میں اور بدھ بھکشوؤں کی قیادت میں مسلمان بستیوں کو گھیرے میں لیا گیا .....ان غنڈوں نے مسلمان نوجوانوں کو پہلے باہر نکال کر قتل کیا اور اس کے بعد لوٹ مار، عصمت دری اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا.....تیس ہزار سے زیادہ اراکانی مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالے گئے .....بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا یہ قتل عام جب جاری تھا تو برما (میانمار) کی حکومت نے مقامی اور غیر ملکی صحافیوں کو شورش زدہ علاقے سے نکال باہر کیا تاکہ یہ سارے مظالم دنیا کی نظروں سے اوجھل رہیں۔

بچ بچا کر نکل جانے والے مسلمانوں نے کشتیوں میں سوار ہوکر جب خلیج بنگال سے بنگلہ دیش میں داخل ہونے کی کوشش کی تو وہاں حکومت کی طرف سے ساحلوں کی نگرانی سخت کر دی گئی تھی۔ پڑوسی مسلمان ملک بنگلہ دیش کی وزیر اعظم اور دیگر وزراء نے ان مسلمانوں کو غیر قانونی داخلے کی صورت میں نہ صرف پناہ نہ دینے کا اعلان کیا بلکہ دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم بھی جاری کیا..... چنانچہ اراکانی مسلمانوں سے بھری سولہ کشتیاں دریا ہی میں غرق کر دی گئیں ..... بعد میں ان ڈوب جانے والوں کی لاشیں پانی پر تیرتی رہیں۔ دوسری طرف جب کچھ کشتیاں رخ موڑ کر پڑوسی ملک تھائی لینڈ کے ساحل پر پہنچیں تو وہاں کی فوج نے بھی تشدد کے بعد انھیں کھلے سمندر میں دھکیل دیا۔

اسلامی قانون تو بہت اعلیٰ و ارفع قواعد دیتا ہے..... حدیث نبوی کے مطابق مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ ظلم کے مقابلے میں اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے..... بنگلہ دیشی سیکولر حکومت نے (اور تھائی لینڈ نے بھی) بین الاقوامی قوانین کا پاس نہیں کیا جس کی رو سے شورش زدہ علاقوں سے نکلنے والے مہاجروں کے لیے پڑوسی ملک سرحدیں کھول دینے کے پابند ہیں (یادش بخیر، حسنی مبارک کے دورِ نامسعود میں غزہ کے مسلمانوں پر جو فضائی بمباری ہوئی، اور ہزاروں فسلطینی شہید ہوئے .....فلسطین سے مصر میں داخلے کی سرحد بھی بند رکھی گئی تھی)

موجودہ شورش میں شہداء کی تعداد بیس ہزار سے کہیں زیادہ ہے..... وہ لاکھوں لوگ، جو در بدر ہیں اور کھلے آسمان تلے بے یار و مددگار پڑے ہیں، ان کے بارے میں بھی برمی حکومت نے بڑی ڈھٹائی سے اقوامِ متحدہ سے مطالبہ کیا ہے کہ انھیں کسی اور ملک منتقل کر دیا جائے۔ یہ درخواست خود برمی صدر نے پیش کی ہے۔ عجیب بات یہ بھی ہے کہ برما کے نہتے اور بے بس مسلمانوں پر اس قسم کا کوئی الزام بھی نہیں ہے جو دیگر خطوں کے مسلمانوں پر دورِ جدید کی مغربی اصطلاحات میں لگایا جاتا ہے، مثلاً انتہا پسندی، تشدد پسندی، یا عسکریت پسندی وغیرہ..... برسوں سے ظلم کی چکی میں پسنے والے اور عالم اسلام سے مایوس مسلمانوں کے پاس شاید اس قسم کا کوئی حوصلہ بچا ہی نہیں۔ رواداری کا ڈھول پیٹنے والی مہذب دنیا اور اس کے

مقاصد کے حصول میں تعاون کرنے والے عالمی ادارے اس متعصّبانہ مطالبے پر بھی خاموش ہیں۔ کسی مسلمان ملک کی طرف سے ایسی بات آتی تو وہ شور اٹھتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی

☆☆☆

حکومتوں کا ذکر چھوڑ دیں تو مسلم عوام ہر جگہ تڑپ اٹھے ہیں۔ پاکستان میں جگہ جگہ مظاہرے ہوئے۔ پاکستانی نژاد برطانوی رکن پارلیمنٹ لارڈ نذیر احمد نے برمی حکومت کو خط لکھا کہ مسلمانوں کی نسل کشی روکی جائے۔ ترکی نے یورپی یونین سے مایوس ہونے کے بعد عالم اسلام کے مسائل اور معاملات میں اپنی دلچسپی بڑھائی ہے، وہاں کے وزیر خارجہ اپنے عوام کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی بیوی اور امدادی سامان کے ساتھ برما پہنچے ..... اخبارات میں تصویر شائع ہوئی کہ ترک وزیر کی اہلیہ ایک مسلمان عورت کی داستان غم سنتے ہوئے خود بھی رو دی ہیں.....لیکن بحیثیت مجموعی عالم اسلام کا جو کردار اور ردعمل ہونا چاہیے تھا..... ڈھونڈے سے بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔

جون کے ابتدائی دنوں میں یہ خونریز فسادات شروع ہوئے تھے۔ اگست کے پہلے ہفتے میں.....(جی ہاں پورے دو مہینے بعد!) او آئی سی کا ''ہنگامی'' اجلاس جدہ میں منعقد ہوا..... اطلاعات کے مطابق میانمار جنرل یونین کے سربراہ ڈاکٹر وقار الدین اس اجلاس میں دھاڑیں مار مار کر روئے اور او آئی سی سے مسلمانوں کی مدد کی اپیل کی۔ ستاون مسلم ممالک کی اس سب سے بڑی تنظیم کے سیکرٹری جنرل اکمل الدین احسان اوگلو نے کانفرنس کے اختتام پر اعلان کیا کہ او آئی سی نے میانمار کے مسلمانوں کے قتل عام پر ''فیکٹ فائنڈنگ مشن'' بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے لیے ''جلد ہی'' میانمار حکومت سے رابطہ کیا جائے گا۔

رمضان کے آخری عشرے میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا سربراہی اجلاس سعودی عرب میں ہونے جا رہا ہے۔ ایجنڈے پر شامی مسلمانوں کا قتل عام بھی ہے اور میانمار کے مسلمانوں کا قتل عام بھی .....ابھی لیبیا کے زخموں سے خون رس رہا ہے .....عراق اور افغانستان کے مسلمان برسوں سے امن سے محروم ہیں، بغداد اور کابل ''بیواؤں کے شہر'' کے نام سے ایک نئی پہچان حاصل کر چکے ہیں..... جہاں مسلمان اکثریت کے ملک ہیں، وہاں اندر کے غاصبوں کے ہاتھوں حالات دگرگوں ہیں..... جہاں اقلیت میں ہیں، وہاں غیروں کی چیرہ دستیوں کا شکار.....معلوم نہیں او آئی سی کیا حل نکالنا چاہے گی تاہم یہ واضح ہے کہ گزشتہ دو ڈھائی مہینوں کی نیم دلانہ کوششوں کے بعد کوئی بڑی امید لگانا خلافِ حقیقت ہوگا۔ عالمِ اسلام کی قیادتوں کی سطح پر ایک مجرمانہ بے حسی کا مشاہدہ ہر عام مسلمان کر رہا ہے۔

☆☆☆

برما کی آبادی کی اکثریت .....یعنی تقریباً پچاسی فیصد بدھ مت سے تعلق رکھتے ہیں ..... پاکستان میں اکثر لوگ ہندوؤں سے واقفیت تو رکھتے ہیں ..... بدھوں کو بہت نہیں جانتے .....چھٹی صدی قبل مسیح میں شمالی ہندوستان سے اس

مذہب کا آغاز ہوا..... آج اگرچہ یہ ایک مستقل مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے لیکن تاریخ ادیان کے اکثر ماہرین اسے ہندو مذہب کی ایک اصلاحی تحریک قرار دیتے ہیں.....اور غالباً یہی درست موقف ہے۔ ہندو مذہب کے بنیادی عقائد ..... چند ''اصلاحات'' کے ساتھ..... بدھ مت کی تعلیمات کا اساسی ڈھانچہ مرتب کرتے ہیں۔

بدھی روایات کے مطابق تلاشِ حقیقت کے برسوں پر محیط راہبانہ سفر کے بعد گوتم بدھ نے جو مذہب پیش کیا اس میں تصور خدا موجود ہی نہیں ہے (جو کسی مذہب کی بڑی اہم بنیاد فراہم کرتا ہے)۔

خدا کا تصور نہیں عبادات، دعا، قربانی وغیرہ جیسے مذہبی مراسم بھی موجود نہیں ہیں..... بدھ کے خیال میں افکار و اعمال کی تطہیر اور پاکیزگی کے لیے خدا کی (نعوذ باللہ) ضرورت بھی نہیں ہے۔ انسان خود ہی چاہے تو اپنی اصلاح کر سکتا ہے..... البتہ بدھوں کا ''اصلاحی ایجنڈا'' اس مذہب کے ماننے والوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک بھکشو.....یعنی تارک الدنیا راہب ..... اور دوسرے عام زندگی گزارنے والے پیروانِ مذہب۔

عامۃ الناس کے لیے پانچ نکاتی پروگرام ہے۔ اور بھکشوؤں کے لیے دس اہم احکام.....تاہم دونوں طبقوں کے لیے ''اہنسا'' یعنی عدم تشدد کا اصول اولین نکتہ ہے۔ اس اصول کی رو سے کسی بھی جاندار کو ہلاک کرنے کی اجازت نہیں ہے .....نہ انسان، نہ حیوان، نہ چرند پرند.....حتیٰ کہ کیڑے مکوڑے بھی.....یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اسلحہ کا استعمال اور کاروبار کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

بھکشو کے معنی بھیک مانگنے والے کے ہیں عامۃ الناس پر لازم ہے کہ اس تارک الدنیا طبقے کی ضروریات خوش دلی سے فراہم کریں۔ یہی ان کے لیے نجات کا راستہ ہے۔ زیب و زینت ان بھکشوؤں پر حرام ہے.....اسی لیے یہ سر منڈوا کر..... اور گیروے رنگ کی دو چادریں لپیٹ کر گویا اپنے آپ کو اس مادی دنیا کی آلائشوں سے الگ کر لیتے ہیں۔ ان کے لیے کسب معاش کا کوئی ذریعہ اختیار کرنا بالکل حرام ہے۔

اس مذہبی روایت کو دیکھا جائے اور موجودہ حالات کو تو عجیب صورتِ حال سامنے آتی ہے بدھ مت کا یہ فارغ البال بھکشو طبقہ (ہر دو معنوں میں .....سر کے بالوں سے بھی فارغ اور روزی روٹی کی فکر سے بھی فارغ) برمی مسلمانوں کے لیے وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ موجودہ حالات میں بھی.....اور گزشتہ ادوار میں بھی برما میں ہونے والے قتل عام کا محرک، موید اور پوری طرح شریک کار..... حالانکہ دنیا بھر میں بدھ مت کی پہچان امن پسندی اور عدم تشدد کے مذہب کی ہے.....مغرب میں اکثر افراد جب کسی نئے دین کی تلاش شروع کرتے ہیں تو اکثر بدھ مت کا مطالعہ اسی شوق میں کرتے ہیں کہ ''امن'' کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

بات مذاہب کے حوالے سے امن اور اہنسا کی ہو تو حضرت مسیح علیہ السلام کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے (یہ

الگ بات کہ ؎ ''دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے'') دو تین سال پہلے پنجاب یونیورسٹی میں چرچ آف انگلینڈ کے چند عہدے داروں کے ساتھ پاکستانی مسیحی رہنما بھی موجود تھے ان سب مہمانوں کی تقریروں کا خلاصہ یہی تھا کہ جناب مسیح علیہ السلام کا پیغام امن اور محبت کا پیغام تھا۔ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر.....اور چھتری کی طرح سروں پر گھما گھما کر انھوں نے بتایا کہ ایسا چھا جانے والا امن ..... ''انجیل مقدس'' کے اقتباس سنائے گئے کہ اگر کوئی تمھارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کے آگے کر دو.....تم نہیں جھگڑو گے تو دوسرا کتنی دیر جھگڑ لے گا۔

عالمی حالات سے بے خبر کوئی یہ وعظ سنتا تو شاید بڑا متاثر ہوتا.....لیکن اس ہال میں بیٹھے ہوئے پڑھے لکھے لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ یہ وہی ہیں جو ابھی ابھی فلوجہ (عراق) میں شہری آبادی پر لاکھوں ٹن بارود اور فاسفورس پھینک کر.....اور صرف ایک شہر میں دو ڈھائی لاکھ لوگوں کو بارِ حیات سے سبک دوش کر کے آئے ہیں۔ انہی دنوں غزہ کی پٹی پر بھی فاسفورس بموں کی بارش ہوئی تھی اور دس دس، بارہ بارہ منزلہ رہائشی عمارتیں اور ان کے مکین اس بمباری کا نشانہ بنے تھے..... بدھ بھکشو اور نمائندگانِ مسیح کس امن اور اہنسا کی بات کرتے ہیں؟

☆☆☆

برما میں مسلمانوں کی ''نسلی صفائی'' کی یہ مہم جو چلی ہے .....کوئی نیا معاملہ نہیں ہے۔ پانچ سو سال قبل سپین کے مسلمانوں کے ساتھ یہ عمل اتنی سفاکی کے ساتھ کیا گیا کہ بعد کے لوگوں نے اسے ''مثال'' قرار دے دیا۔ مثلاً ایک ہندوستانی مصنف نے لکھا کہ مسلمانوں کے مسئلے سے نپٹنے کے لیے حکومت کو سپین کی طرف ایک وفد روانہ کرنا چاہیے۔

انیس سو نوے کی دہائی میں بوسنیا کے ساتھ یورپی ممالک نے یہی معاملہ کیا جب متعصب سرب قوم کی مسلمانوں کے مقابلے میں حمایت اور اسلحے سے مدد کی گئی۔ بوسنیائی مسلمانوں کو ہتھیاروں کی فراہمی روک دی گئی کہ ''خانہ جنگی روکنا'' مطلوب ہے۔ حالانکہ مطلوب انھیں ہاتھ پاؤں باندھ کر سرب درندوں کے آگے ڈال دینا تھا۔ ناٹو کی سپاہ وہاں ''بحالیٔ امن'' کے نام پر اتاری گئی جس نے سراجیوو، موستار اور سربرینیکا کے قتل عام کی نگرانی کی۔

ہندوستان کی مسلم اقلیت کے معاملات سے ہم واقف ہیں۔ امریکہ اور یورپی ممالک میں اپنے لباس اور دیگر شعائر کی پابندی کے حوالے سے مسلمان اکثر دباؤ کا شکار رہتے ہیں۔ تھائی لینڈ اور فلپائن میں بھی مسلمان اقلیت کے حالات دگرگوں ہی ہیں اگرچہ میڈیا پر ایسی خبریں آنے ہی نہیں دی جاتیں۔

اس کے مقابلے میں اسلامی تاریخ کو دیکھا جائے تو اقلیتوں کو بے مثال تحفظ حاصل رہا۔ اموی، عباسی اور حتیٰ کہ عثمانی ترکوں کے عہد میں یہودیوں جیسی متعصب اقلیت کے ساتھ وہ رواداری برتی گئی جس کے اعتراف پر دشمن بھی مجبور ہیں۔

☆☆☆

برما کے مسلمانوں کے لیے امدادی سامان کی ضرورت بھی ہے کہ وہ کھلے آسمان تلے پڑے ہیں..... برمی حکومت پر دباؤ بڑھانے کی بھی ضرورت ہے..... ہر عالمی فوم پر یہ مسئلہ اٹھایا جائے اور مسئلے کا حل نکالا جائے .....لیکن وہ جو حدیث نبویؐ ہے کہ اس امت کے آخر کی اصلاح بھی اسی سے ہوگی جس سے پہلوں کی ہوئی تھی.....وہ کچھ اور طرح کے لائحۂ عمل کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے.....جس دن برما کی خاتون سے میری ملاقات ہوئی .....وہی دن تھا یا اس سے اگلا ..... جب انھوں نے آ کر بتایا کہ مغرب کی نماز ختم ہوئی تو ایک نوجوان تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بے اختیار چلا اٹھا 'لا بد بالجہاد'.....اب جہاد کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا..... پتہ نہیں غریب کہاں کا تھا.....اور کن حالات کا ستایا.....اپنے اردگرد اپنی ''مسلمان برادری'' کو دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا.....لیکن ہوا یہ کہ دائیں بائیں سے کچھ لوگ اٹھے اور اس مضطرب نوجوان کو پکڑ کر.....اور تھپک کر بٹھا دیا..... بڑے بوڑھوں نے شاید اسے سمجھایا ہوگا کہ بھئی .....اب عالمی اداروں کی بالادستی کا زمانہ ہے۔اب معاملات میزوں پر ٹھنڈے کمروں میں اور کانفرنسوں میں طے پاتے ہیں۔ظالموں کا ہاتھ پکڑنا اور کلائی مروڑ دینا پرانے وقتوں کے نعرے ہیں (اساطیر الاولین) یہ اس دور میں نہیں چلیں گے۔اب معتصم باللہ نہیں رہے..... عورتیں اپنے نالہ وفریاد کو تھام لیں۔ان بزرگوں نے تھپک تھپک کر اسے احساس دلایا کہ

عراق میں جو کچھ ہوا تھا..... یا برما میں جو کچھ جاری ہے ..... یا جو فلسطین میں ہوتا رہا ہے اور بوسنیا، چیچنیا، کشمیر اور افغانستان میں ہو رہا ہے.....مسلمانوں کو بس شور مچاتے رہنا چاہیے کہ اوآئی سی کچھ کرے.....عالمی برادری نوٹس لے..... دنیا دیکھے.....اور اگر سارے لوگ ہی آنکھیں بند کر لیں..... ساری دنیا نہ دیکھنے کا فیصلہ کر لے تو ہمیں بھی نہیں دیکھنا چاہیے .....مسلم سپین صدیوں سے امت کو رلا رہا تھا.....اب برما ایک اور ''مقامِ گریہ'' بننے جا رہا ہے تو امت کے نوجوان چپ رہیں۔

☆☆☆

غزل

تکبر کا آتش فشاں دیکھتی ہوں
میں جھلسی ہوئی بستیاں دیکھتی ہوں

شہیدِ وطن سرخرو ہورہے ہیں
میں جلتی ہوئی کشتیاں دیکھتی ہوں

کرم کررہے ہیں ستم ہورہاہے
زمانے کی نیرنگیاں دیکھتی ہوں

گلوں کے لبوں پر فسردہ تبسم
بہاروں پہ رنگِ خزاں دیکھتی ہوں

وہ انصاف دینے چلے آرہے ہیں
میں انصاف کی دھجیاں دیکھتی ہوں

پھریرے اڑاتے ہیں رحم وکرم کے
میں گرتی ہوئی بجلیاں دیکھتی ہوں

وہ جمہوریت کی اذاں دے رہے ہیں
میں جمہور کی کرچیاں دیکھتی ہوں

تعلق جہاں کے کشیدہ کشیدہ
میں ہر جا کدورت نشاں دیکھتی ہوں

یہ عبرت کی جا ہے نصیحت کو نزہتؔ
الٹتی ہوئی برجیاں دیکھتی ہوں

ڈاکٹر نزہت اکرام

ڈاکٹر صاحبہ نے چند ماہ قبل جو کلام برائے اشاعت مرحمت فرمایا، اس میں سے ایک (مدیرہ)

نعت

بے تحاشہ دل مرا قابو سے باہر جائے ہے
جب کبھی سرکارؐ کی بستی مجھے یاد آئے ہے

روح پھڑکے ہے جگر کانپے ہے دل تھرّائے ہے
چُپ رہا جائے ہے مجھ سے اور نہ بولا جائے ہے

جاگتا ہوں تو محبت ان کا دل بہلائے ہے
نیند آتے ہی ہرا گنبد نظر آ جائے ہے

وہ مسافر کیا جو بچتا جائے بچتا آئے ہے
سرخرو وہ ہے محبت میں جو پتھر کھائے ہے

چل مدینے کو کہ یہ بستی ہے وہ بستی میاں!
ہر گلی بستی کی جنت کی گلی کہلائے ہے

ہے دعا یہ خاتمہ شہر نبیؐ میں ہو شہودؔ
ہر مسافر شام کو گھر اپنے واپس آئے ہے

شہود ہاشمی۔ریاض

تیرے گھر کے صحن میں!

تیرا ہی کرم ہے جو مری بات بنی ہے
رحمت جو تری میرے قدم چوم رہی ہے

جس شہر کی حُرمت کی قسم کھائی ہے تُو نے
یہ چشمِ گنہگار اُسے دیکھ رہی ہے

دل فرطِ عقیدت سے جھکائے ہے نگاہیں
دیوار و درِ کعبہ پہ گو آنکھ جمی ہے

اُتری ہے نئی تازگی سہمے ہوئے دل میں
اک روشنی تاحدِّ نظر پھیل گئی ہے

لگتا ہے کہ جیسے تو یہیں پاس کھڑا ہے
رحمت تیری، منگتوں کو یہاں ڈھونڈ رہی ہے

اک خاص تجلّی سے ہیں معمور فضائیں
اک نور کے سیلاب میں جاں ڈوب گئی ہے

حاضر ہیں لیے داغِ جبیں، زود پشیماں
بخشش کے طلبگاروں کی اک بھیڑ لگی ہے

ہیں حق کی گواہی لیے حاضر تیرے خدام
لبیک کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے

ہیں شدتِ احساس سے مغلوب دعائیں
دل کانپ رہا ہے تو زباں گنگ ہوئی ہے

مانگی ہے ہر اک جرم کی اس دل نے معافی
مل جائے ہمیں رحم یہ درخواست تو کی ہے

شمیم فاطمہ

ہجر موت کا فرشتہ

ہے تعاقب میں میرے صدیوں سے
چاپ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا
اک دھواں پیشِ منظرِ ہستی
ایک آنسو پلک میں جلتا ہوا
میں کہیں سے کہیں چلی جاؤں
صورتِ مہر وماہ پھر ابھرے
پھر وہی درد دل میں پلتا ہوا
ہے تعاقب میں کتنی صدیوں سے
چاپ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا

اس کو حاصل ازل سے ہے ملکہ
جسم سے روح کھینچ لیتا رہے
تجربہ ہے اسے ، کڑے صدمے
اس تنِ ناتواں کو دیتا رہے
بے کراں انتظار خوفِ حیات
صفحۂ لوح پر نوشتہ ہے یہ
راستے میں سدا سے ٹھہرا ہوا
لمحۂ حال یا گزشتہ ہے یہ
گردشِ خون میں یہ شامل ہے
کیسا بچپن کا اس سے رشتہ ہے یہ
ہر گھڑی میری جان کے درپئے
ہجر، کیا موت کا فرشتہ ہے یہ؟

ہے تعاقب میں میرے صدیوں سے
ہجر اس سر پہ آسماں کی طرح
رقص گاہِ حیات میں ہم رقص
میرے ہم شکل، ہم زباں کی طرح
ہے تعاقب میں میرے صدیوں سے
چاپ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا

رخشندہ نوید

غزل

پیسہ پیسہ ڈھیر کرو ہو پیسہ کیا لے جاؤ گے
سب کچھ رہ جائیگا پیارے! خالی ہاتھ ہی جاؤ گے

بولتی چڑیا اڑ جائے گی دیکھتے ہی رہ جاؤ گے
جو کچھ ہے سب کھو جاؤ گے صرف کفن ہی پاؤ گے

جیون کا کچھ نہیں بھروسہ دنیا آنی جانی ہے
کام کرو کچھ اچھا بھائی ورنہ پھر پچھتاؤ گے

موسم نے جب بھی رت بدلی آنکھیں میری بھیگی ہیں
سونا پڑا ہے آنگن میرا ساجن گھر کب آؤ گے

ساون نے انگڑائی لے کر میرے درد کو چھیڑا ہے
بوند بوند کو ترس رہا ہوں بادل بن کب چھاؤ گے

تم جو شہوؔد اب چین کی خاطر نگری نگری پھرتے ہو
پہروں پہروں منزل منزل چل چل کر تھک جاؤ گے

شہود ہاشمی۔ریاض

بی رانی ذرا خبر تو لو چھوٹا کب کا رو رہا ہے کیا گھوڑے بیچ کر سوئی ہو؟'' حسنہ کی ساس نے دنیا جہان سے بے خبر سوئی حسنہ کو جگایا۔

''ہائیں کون رو رہا ہے؟ ''ہڑ بڑا کر حسنہ اٹھ بیٹھی اور دوسالہ بیٹے منیب کو دیکھا جو رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ دوسری طرف بھی میدان گرم بلکہ سرگرم تھا۔

''اے مجھ میں ایسا دم خم کہاں جو روتے بچوں کو چپ کراؤں۔''

دل تو چاہ رہا تھا سب کو ان کے حسب حال چھوڑ کر دوبارہ سو جائے لیکن دل کے چاہنے پر آنکھیں بند کر کے عمل تو اس نے کبھی بھی نہ کیا تھا۔ سو اٹھ بیٹھی۔ دماغ بری طرح تھکا ہوا تھا، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری، قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ جیسے کوئی مسلسل اٹھاون گھنٹے سفر کر کے ہچکولوں کی زد میں رہتا ہے ویسے ہی ہچکولے وہ کھا رہی تھی۔ حالانکہ نہ اس نے ٹرین کا سفر کیا تھا نہ کرنے کا ارادہ تھا!

اس نے منیب کا پراٹھا بناتے ہوئے سوچا۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹے حساب کتاب کا کھاتہ کھولا۔ بھلا وہ اڑتالیس گھنٹوں کے بعد کیوں سوئی؟ اور اکثر اس کے ساتھ ہی ایسے کیوں ہوتا ہے کہ سونے کے اوقات میں دنیا بھر کے ہنگامے اس کیلئے جاگ جاتے ہیں؟

تازہ ترین مصروفیت۔ ہاں یاد آیا دو دن قبل اسکی خالہ ساس بچوں کے ساتھ آئی تھیں، سارا دن کی میزبانی کی بازار کا چکر لگایا، رات کو جب وہ لوگ روانہ ہوئے، تو ساڑے دس

میٹھا میوہ

پونے گیارہ کا وقت تھا، خیال تھا کہ ایک آدھ گھنٹہ میں سو جائے گی۔ پچھلی رات میں بس دو اڑھائی گھنٹے ہی سو سکی تھی۔ خالہ ساس انگلینڈ سے چار پانچ سالوں کے بعد آئی تھیں۔ دن میں بجلی نہیں تھی، رات کو بجلی آئی تو کھانے پکانے دھونے دھلانے کے کام مکمل کیے۔ جب کاموں کا پھیلاؤ سمیٹ کے سونا چاہا تو منیب کا باجا بج گیا۔ وہ بے وقت سو گیا تھا اور اب اسی حساب سے اٹھا۔ اسے سُلا کے لیٹی تو ماریہ نے فرمائش کی

''اماں مجھے ایک گھنٹے تک لازماً اُٹھا دیں۔ میری آنکھیں نیند سے بند ہو رہی ہیں پڑھا نہیں جا رہا کل بہت مشکل پیپر ہے۔'' لمبی سی جمائی لے کر اس نے بات مکمل کی۔

نیند سے حسنہ کا بھی برا حال تھا۔ اس نے کسلمندی سے کہا ''بیٹا! اپنے موبائل پر الارم سیٹ کر لو۔''

ماریہ زور سے ہنسی ''امی مجھے جتنی نیند آ رہی ہے سارے شہر کے الارم مل کر نہیں اٹھا سکتے۔ پلیز امی'' اس نے منت کی۔

''ٹھیک ہے تم سو جاؤ، لیکن اگر اٹھانے پر بھی نہ اٹھیں تو؟''

''یہ لیں پانی کا جگ حاضر ہے، چاہیں تو برف بھی شامل کر لیں ستمبر کی گرم رات میں مزہ آ جائے گا۔ اور ایک کپ کڑک چائے باقی رات جگانے کیلئے مددگار ہوگا'' تکیہ منہ پر رکھ کر سونے کی عادی ماریہ نے کہا۔

''اچھا!'' مری مری آواز میں حسنہ نے کہا۔

وہ گھنٹہ بس سونے جاگنے کی درمیانی کیفیت میں گزرا!!

ماریہ کو اٹھانے، پھر بٹھانے، پھر چائے کا کپ دینے میں، پورے بتیس منٹ لگے، تو یاد آیا اطہر نے بھی کچھ ذمے لگایا تھا ''امی میری اسائنمنٹ مکمل ہونے والی ہے کل آخری تاریخ ہے مجھے رات دو بجے تک لازماً اٹھا دیں، ورنہ آپ کا نالائق بیٹا مزید نالائقوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔'' دو بجے کے انتظار میں وہ اونگھتی رہی اس ڈر میں کہ وہ گہری نیند نہ سو جائے، وہ بار بار چونک کر اٹھ بیٹھتی۔

تین بجے آسٹریلیا سے اسکی نند کا فون آ گیا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہاتھ سے ریسور اٹھایا۔

''کمال ہے بھابھی میں تو فون بند کرنے لگی تھی ایسی بھی کیا گہری نیند کہ چوتھی دفعہ کال کی ہے۔ توبہ ہے'' اس لاڈ و مارکہ کے لہجے میں خفگی ہی خفگی تھی۔

وہ جواب کیا دیتی، بس اس کی داستان امیر حمزہ سنتی رہی فون ختم ہوا تو اذان میں تھوڑی دیر تھی۔ ہائے سو جاؤں یا؟ نیند بہت آ رہی ہے اور نیند میں تو نماز نہیں ہوتی۔ شیطان نے اکسایا نفس پر خوف خدا غالب آیا اس نے وضو کر کے نفلوں کی

نیت باندھی۔نفل میں کیا پڑھا کچھ یادنہیں بس بار بار نیند کے جھونکے آرہے تھے۔

میٹھی میٹھی نیند ۔ٹھنڈا ٹھنڈا بستر ،کیسا خوش کن خیال،جیسے..... جیسے وصل محبوب.....اپنی مثال پر وہ خود ہی مسکرادی!!

نماز پڑھتے ہی میاں صاحب آ گئے ۔چونکہ وہ سارادن فائلوں میں سرکھپا کرآتے تھے اس لئے ان کو نیند کی اشد ضرورت تھی۔ یہاں منیب بار بار ڈسٹرب کرتا تھا لہٰذا انہوں نے اپنا بوریا بستر کمپیوٹر والے کمرے میں ڈال لیا تھا۔ جہاں ساری رات خواب خرگوش کے مزے لینے کے بعد سارادن ''گدھوں'' کی طرح کام میں جُت جانا ہوتا تھا!!

''مجھے تو آج جلدی آفس جانا ہے،سالانہ فنکشن کیلئے میری ذمہ داری ہے پروموشن کے چانسز ہیں ناشتہ جلدی بنادو۔ ہری اپ،نیند پوری نہیں ہوئی ابھی تک بیگم نندیاپور!!''

چارساڑھے چار میل لمبا ٹھنڈاسانس لے کر میاں کو ناشتہ دیا تو بچوں کے سکول کالج کی وین رکشے کا وقت ہونے والا تھا!!

جس کی راتیں اتنی مصروف ہوں دن اس سے کہیں مصروف ہوتے ہیں۔سارادن آیا گیا،کھانا پکانا،اچھی نیند کی خواہش میں دن بھی گزر گیا۔رات دس بجے میاں کے آنے تک بیٹھے بیٹھے وہ نیند کے جھولے لیتی رہی۔

میاں صاحب کو کمپنی دی۔کھانا کھلایا۔فارغ ہوئی تو پھر وہی سلسلہ۔

''امی کل میرا ازحد ضروری ٹیسٹ ہے دوبجے اٹھادیں۔''

اور''اماں جانی مجھے نیٹ پر کچھ ریسرچ کرنا ہے ،ضروری،ضروری،جونہی بجلی آئے مجھے اٹھادیں'' مقام صد شکر ہے کہ دودن سے ماہا کو ہوم ورک نہیں مل رہا تھا۔منیب بھی بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا!!

نیند، اچھی سی نیند، تکیے کے سہارے لیٹنا،بچوں کے جھمیلے۔سب کچھ ذہن میں گڈ مڈ ہورہا تھا۔آخری خیال جس نے اس کے سست وجود میں چستی پیدا کی،آنکھوں میں چمک آ گئی،وہ ایک ہی تھا۔

اللہ تیرا شکر ہے۔اگر بچے ہیں تو جھمیلے ہیں۔ وہ گھر جہاں یہ غنچے نہیں وہاں مالی سارا دن کیا کرتے ہوں گے؟ حسرتوں کے انبار تلے تنہائی کیسے کیسے نہ ڈستی ہوگی اور ویرانی وہاں کیسے نوحہ پڑھتی ہوگی!!وہاں کے درودیوار ننھے منے ابلتے قہقہوں کو کیسے ترستے ہوں گے!اولاد میٹھا میوہ ہے۔

دل ہی دل میں شکرادا کرکے اس نے بستر سے قدم نیچے اتاردیا۔

☆☆☆

تمہارا شکریہ

منیٰ کے میدان میں تاحدِ نگاہ خیمے ہی خیمے نظر آ رہے تھے۔ ان خیموں کے اندر اور باہر ایک ہی وضع قطع کے سفید لباس میں ملبوس بے شمار مخلوق چلتی پھرتی دکھائی دیتی تھی۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے، ان کے چہروں پر عاجزی اور فروتنی چھائی ہوئی تھی، ان کی کشادہ پیشانیاں چمک رہی تھیں، ان کی آنکھوں میں سکون کی پرچھائیاں نمایاں تھیں، ان کے دلوں میں امید اور محبت کی شمعیں روشن تھیں، ان کا راستہ ایک تھا، ان کا مقصد ایک تھا، انکی چاہت ایک تھی، ان کا ورثا ایک تھا، ان کا محبوب ایک تھا، ان کا مسجود ایک تھا، ان کے دلوں میں ایک ہی لگن تھی، ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی منظر تھا، ان کے قدم ایک ہی جانب اٹھ رہے تھے، ان کی زبانیں ایک ہی ذات کے ذکر سے آراستہ تھیں، ان کے خیالات کا محور ایک تھا، ان کے جذبات کا مرکز ایک تھا، وہ سب ایک ہی در کے سوالی تھے، وہ ایک ہی کشتی کے سوار تھے، وہ ایک ہی منزل کے راہی تھے، وہ سب ہمسفر تھے، وہ ہم نوا تھے، وہ ہم رکاب تھے، وہ ہم نشین تھے، وہ ہم راز تھے، وہ ہم خیال تھے، وہ ایک ہی محمل کے مسافر تھے۔

وہ خاک نشین تھے لیکن ان کی نگاہوں کا مرکز آسمان تھا، وہ پستی کے مکین تھے لیکن ان کا رشتہ بلندیوں سے تھا، ان کے قدم زمین پر تھے لیکن ان کے تذکرے آسمانوں میں ہو رہے تھے، ان کے وجود نشیب سے پیوستہ تھے لیکن ان کی پرواز فلک سے ماورا تھی۔ ان کے دامن آسمان کی وسعتوں اور رفعتوں کو سموئے ہوئے تھے، پستی اور بلندی کا یہ ملاپ کس قدر حیرت انگیز اور روح پرور تھا ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کائنات سمٹ کر رہ گئی ہو اور اس میں صرف دوستیاں باقی رہ گئی ہوں۔

آقا اور غلام، بندہ اور بندہ نواز، محتاج اور غنی، شمع اور پروانہ، داتا اور سائل، شہنشاہ اور درباری، ذرہ اور آفتاب، محرم اور مجرم، نکتہ اور ابجد، راعی اور رعایا، کنواں اور پیاسے، رحمٰن اور انسان، خالق اور مخلوق، حاکم اور محکوم، طالب اور مطلوب، شاہد اور مشہود، ساجد اور مسجود، مالک اور مملوک، غالب اور مغلوب،

مالکِ عرش بریں اور اہل زمین۔

غلام نے آگے بڑھ کر آقا کا دامن تھام لیا تھا۔ آقا کی رحمت جوش سے ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ آسمان سے عنایات کی موسلا دھار بارش برس رہی تھی۔ یہ بارش غلام کے قلب وذہن پر نچھاور ہو رہی تھی۔

فضا میں جادو کا اثر تھا۔ غلام مسحور ہو رہے تھے۔ وہ خوف اور گھٹن کی قید سے رہا ہو کر آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔ وہ محبت کی لذت کے مزے لوٹ رہے تھے، وہ ایمان کی حلاوت سے سرشار ہو رہے تھے، وہ عرفان اور آگہی کے اسرار رموز سے آشنا ہو رہے تھے، وہ اپنی ذات اور اوقات کو جان رہے تھے وہ اسکی شان کو پہچان رہے تھے۔

غریب اور امیر کا فرق مٹ چکا تھا۔ چھوٹا اور بڑا سب یکساں تھے۔ انسانوں کے خود ساختہ امتیازات مٹی میں مل گئے تھے اور اب زمین پر مساوات کی عملی تصویر ابھر آئی تھی۔ رنگ ونسل، ذات پات، اونچ نیچ کے سب قوانین کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ ان سب کے ذہنوں میں سے من کا احساس غائب ہو چکا تھا، ان کے دلوں سے صرف تو کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، وہ اپنی خوش نصیبی اور سعادت کے بارے میں حیرت زدہ تھے اور ان میں سے ہر ایک دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ؎

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے۔ عصر کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ موذن کی دل پذیر آواز ہوا کے دوش پر لہرا لہرا کر کانوں کے راستوں سے داخل ہو کر دل کی بستیوں پر دستک دے رہی تھی۔ آن کی آن میں ان سفید پوش انسانوں کا ہجوم اپنے اپنے خیموں سے باہر نکل کر بے اختیار آواز کی سمت رواں دواں ہو گیا۔

اس ہجوم میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے زمین جگہ جگہ سے شق ہو گئی ہو اور اس کا سینہ ان انسانوں کو دھڑا دھڑ اگل رہا ہو۔ میں بھی اس ہجوم بیکراں کا ایک حصہ تھی میں بھی انہی انسانوں کے جلوس میں آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ چلتے چلتے ہم میں سے بہت سے لوگ وضو کرنے کیلئے ایک جگہ رک گئے باقی لوگ اسی مقصد کیلئے دوسری مقرر کردہ جگہوں پر چلے گئے میرے سامنے زمین کی سطح سے قدرے بلند جگہ پر سیمنٹ سے بنا ہوا ایک طویل چبوترا تھا۔ جس کے ایک کنارے پر جا بجا نلکے لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ ان نلکوں کے پانی سے وضو کر رہے تھے۔ اور باقی لوگ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ میں بھی اسی منتظر ہجوم میں شامل تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ رش کی وجہ سے باری ابھی کوسوں دور تھی۔

میرے سامنے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے مختلف رنگ ونسل اور ذات پات کے بے شمار لوگ تھے۔ اچانک میری نظر ایک آٹھ نو سالہ بچے پر پڑی اور وہ بچہ میری توجہ کا مرکز بن کر رہ گیا۔ وہ سفید احرام میں ملبوس تھا۔ اسکے احرام کی چادر میں سیفٹی پن ٹیڑھی ہو کر پھنس چکی تھی۔ اس کی ماں اس پن کو چادر میں سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب ماں کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ کے آثار ہویدا ہو گئے تھے۔ میں نے بچے

کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔اس کا سیاہ رنگ اس کے سفید بے داغ براق احرام میں چمک رہا تھا۔ پتہ نہیں اس کا یہ گہرا سیاہ رنگ دیکھ کر میری نگاہوں کے سامنے مور کیوں ناچنے لگے۔ میرا ذہن کیوں اسکے رنگ اور مور کے رنگوں کا موازنہ کرنے لگا۔ میں سوچ رہی تھی جس طرح مور کی گردن کے اردگرد پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے خوبصورت رنگ کے پروں کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو بسا اوقات پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور انکی شوخی ، گہرائی اور چمک آنکھوں کے سامنے لہراتی ہوئی ذہن میں پھیل جاتی ہے۔ پھر یہ چمک دیکھنے والے کو مسحور کر دیتی ہے۔اس چمک کی کشش اسکے قدم گویا زمین میں گاڑ دیتی ہے اور وہ حیرت زدہ ہو کر پلکیں جھپکانا بھول جاتا ہے۔ بس اسی طرح میں جوں جوں اس کے چہرے کو غور سے دیکھی جارہی تھی ،توں توں اس کی سیاہ فام شخصیت کی چمک مجھے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے آس پاس کے سب منظر دھندلا گئے ہیں۔ پھر اچانک میرے وجود میں مامتا کا جذبہ ابھر کر چھا گیا تھا۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے میں ماں ہوں ،صرف ماں ،مجسم ماں اور ماں کے سوا کچھ نہیں۔ پھر کسی جادوئی کشش کی وجہ سے میرے قدم بے اختیار اسکی طرف اٹھ گئے۔ میں جب اسکے قریب پہنچی تو اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی ماں سے پوچھا کہ ''کیا میں یہ سیفٹی پن نکالنے کیلئے اسکی مدد کرسکتی ہوں؟''

اسکی ماں نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی کوشش سے دستبردار ہوتے ہوئے پرے ہوگئی۔ میں نے بڑے آرام سے سیفٹی پن کو پکڑ کر کھینچا اور پن چادر سے نکل کر میرے ہاتھ میں آرہی۔ اسکی ماں کا تنا ہوا چہرہ ایکدم پرسکون ہوگیا۔ بچے نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ وہ چپ تھا لیکن اسکی آنکھیں بول رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اپنائیت کا پیغام تھا، اس کی آنکھیں دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی تھیں،اس کی آنکھیں شکریہ ادا کررہی تھیں،اس کی آنکھیں سراپا شکر گزار تھیں۔ میں نے جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اس سے اس کا نام پوچھا۔

''محمد۔''اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا''محمد! کیا تم جانتے ہو کہ جس طرح یہ نام تمہاری ذات کا ایک حصہ ہے اسی طرح یہ نام میری شخصیت کا بھی اٹوٹ انگ ہے،اس نام سے میری نسبت بھی بہت گہری ہے۔ یہ نام میری رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے، یہ نام میری نس نس میں بسا ہوا ہے،میرا دل اس نام کی محبت سے سرشار رہتا ہے اور میرا رواں رواں اس نام کی بلائیں لیتا ہے۔اور محمد! کیا تم جانتے ہو کہ تمہارا نام دنیا کے سب ناموں سے بڑھ کر خوبصورت،معزز اور محترم ہے۔''

محمد نے اثبات میں سر ہلایا۔اس کی آنکھوں میں خوشی اور فخر کے سائے لہرا رہے تھے۔

میں نے اسے کہا

''محمد! کیا تم جانتے ہو تم بہت خوش قسمت بچے ہو کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ مناسک حج ادا کرنے

کیلئے یہاں آئے ہو۔تمہارے ننھے منے قدم زمین کے اس حصے کو چھو رہے ہیں جہاں انبیاء کے قدموں کے نشانات ثبت ہیں۔''

میری بات سن کر محمد نے اپنا سر اوپر سے نیچے ہلایا۔ میں نے اسکی آنکھوں میں جھانکا۔اسکی آنکھوں سے یقین اور اعتماد جھلک رہا تھا۔میں نے اسے کہا

''محمد! کیا تم جانتے ہو کہ تم سے مل کر مجھے دلی خوشی ملی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے خاندان کے کسی فرد سے ملی ہوں، جیسے اچانک غیر متوقع طور پر میری ملاقات اپنے کسی عزیز دوست سے ہوگئی ہو، جیسے میرا کوئی دیرینہ آشنا مجھے سرراہ مل گیا ہو، جیسے بچھڑے ہوئے بیٹے سے ملی ہوں۔''

اب محمد کی آنکھوں میں اپنائیت کا احساس جھلکنے لگا اور اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا

''محمد! میرے ایک بیٹے کا نام بھی محمد ہے۔وہ پاکستان میں ہے اور جس طرح مجھے وہ بے حد عزیز ہے اسی طرح تم بھی مجھے بہت پیارے لگتے ہو۔''

یہ کہہ کر میں نے جھک کر اسکے سر کے دونوں اطراف کو اپنے ہاتھوں سے تھام کر اسکی پیشانی کو چوم لیا۔بالکل اسی طرح جیسے میں پاکستان میں فرط محبت سے محمد کو چوم لیتی ہوں ہم دونوں کو دیکھ کر اسکی ماں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔وہ مجھے کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن اس کی آواز بھرا گئی۔اس کے ہونٹ ہولے ہولے پھڑ پھڑانے لگے۔کوشش کے باوجود وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ بس اس کے گالوں پر موٹے موٹے آنسو بہہ نکلے۔اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر دبایا۔میں نے اسے کہا

''بیشک تم کچھ نہ کہو۔ماں ہونے کے ناطے تمہارے جذبات سے آگاہ ہوں۔میں جانتی ہوں کہ مائیں اگر خوش ہوں تو مارے خوشی کے بے اختیار رو دیتی ہیں۔ مائیں اگر اداس ہوں تو بھی ان کی آنکھوں میں نمی تیرے لگتی ہے۔ماؤں کو اگر اولاد کی طرف سے سکھ ملے تو بھی اشکبار ہوجاتی ہیں۔اگر ان کو اولاد کی طرف سے تکلیف پہنچے تو بھی وہ سسکنے لگتی ہیں۔اولاد کو اگر عزت اور کامیابی ملے تو بھی انکی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔اولاد کو اگر کوئی تکلیف پہنچے تو بھی ان کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں۔''

واہ ری میّا.....تو اپنی اولاد کی محبت کے سامنے کس قدر کمزور اور بے بس ہے کہ تیری زباں گنگ ہوجاتی ہے۔الفاظ تیری گرفت سے پھسل جاتے ہیں۔ اور تیرا اختیار اپنے آنسوؤں پر رہتا ہے نہ الفاظ پر نہ جذبات پر.....

عصر کی نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔لہٰذا ہم تینوں نے باری باری وضو کیا اور الوداع کہنے کیلئے ایک دوسرے کے قریب آئے۔میں نے محمد سے کہا''محمد! زندگی میں ہم شاید دوبارہ کبھی نہ مل پائیں۔لیکن میری ایک بات یاد رکھنا کہ آج سے کئی سالوں کے بعد جب وقت کی رفتار ہم دونوں کے حلیے کو بدل کر رکھ دے گی۔اور تم ایک تنومند کڑیل جوان کا روپ دھار لوگے جبکہ میری توانائی بڑھاپے اور کمزوری میں ڈھل جائے گی۔ اس وقت بھی میں تمہیں بھول نہیں پاؤں گی۔تمہاری یہ معصوم

اور دلکش شخصیت میرے ذہن میں کسی جگنو کی مانند چمکتی رہے گی۔تم مجھے ہمیشہ یاد آتے رہو گے اور میں تمہاری کامیابیوں اور خوشیوں کے لئے دعا گو رہوں گی۔''

میری باتیں سن کر اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں،اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس کے سفید بند کلیوں جیسے خوبصورت دانت اس دہانے سے جھانکنے لگے،اس نے اپنی ننھی منی باہیں پھیلا دیں اور مجھ سے لپٹ گیا۔

اسکی ماں نے مجھے خدا حافظ کہا،اس کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر چلدی۔ میں ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دور جا کر محمد نے مڑ کر مجھے دیکھا، اسکی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں اداسی چھا گئی تھی جیسے وہ مجھے الوداع کہہ رہی ہوں۔اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور اسے لہراتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں چند لمحے وہیں کھڑی رہی اور پھر اپنے خیمے میں لوٹ آئی۔

مجھے محمد سے ملے اور بچھڑے کئی سال بیت چکے ہیں لیکن وہ آج بھی میرے تصور میں زندہ ہے۔ میں اپنے دل ہی دل میں جونہی اسے پکارتی ہوں وہ فوراً میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور میں اسے کہتی ہوں کہ

''محمد! کیا تم جانتے ہو کہ میری یادوں کی البم کا ایک خوبصورت باب بن چکے ہو اور محمد! کیا تمہیں علم ہے کہ اچھی یادیں ہماری زندگی کی دنیا میں چمکتے دمکتے سورج کی روپہلی کرنوں کی مانند ہوتی ہیں۔جوں جوں خوبصورت یادیں کرنوں کا روپ دھار کر ہماری ذات کے اردگرد جمع ہوتی چلی جاتی ہیں،توں توں ہمارے وجود کی دنیا قوت،حرارت اور روشنی سے جگمگا اٹھتی ہے۔ میری حسین یادوں کے ذخیرے میں تمہاری خوبصورت اور معصوم شخصیت نے خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

تمہاری اس عنایت کا شکریہ،تمہارے اس احسان کا شکریہ۔میرے ننھے دوست تمہارا بے حد شکریہ۔

☆☆☆

ڈاکٹر ممتاز عمر

بھلائی

معذور افراد کسی ظاہری جسمانی کمی کا شکار ہوتے ہیں اس لیے ان میں احساس محرومی بھی پایا جاتا ہے جو ان کے لہجے میں بدمزاجی و چڑچڑے پن کو فروغ دیتا ہے۔ کبھی تو یہ انداز درست ہوتا ہے مگر بیشتر مواقع پر خصوصی افراد احساس کمتری کی بنا پر خود سے ہونے والی ناانصافی کو بڑھا چڑھا کر محسوس کرتے ہیں جو ضدی اور خودسری کی حد تک انہیں بدمزاج بنا دیتی ہے۔ میں بھی پیدائشی طور پر بصارت سے محروم ہوں۔ پہلے بینائی اتنی ضرور تھی کہ دن کی روشنی میں اپنے امور نمٹا لیتا تھا مگر جوں ہی شام کے سائے بڑھنے لگتے میری بینائی بھی اچک کر لے جاتے۔ میرے ہم عمر ساتھی جب کھیل میں مصروف ہوتے تو میرا دل بھی بہت چاہتا کہ ان کے ساتھ دوڑوں بھاگوں۔ دل سے مجبور کبھی ان کی ہم سری کی کوشش کرتا تو بہت جلد کسی شے سے ٹکرا کر گر پڑتا۔ یوں کھیل سے حاصل ہونے والی خوشی کے بجائے اپنے درد کو سہلاتا۔ ایک طرف بیٹھ کر اپنی معذوری پر کڑھتا کہ آخر سب تو ٹھیک ہیں میں کیوں اس نعمت سے محروم ہوں۔ نتیجتاً غصہ اور چڑچڑا پن غالب ہوتا جو میرے لہجے میں بدمزاجی کا باعث بنتا رہا۔ حساسیت حد سے بڑھتی رہی اس لیے مزاج کے خلاف کسی بات کو قبول نہ کرتا۔ خوداعتمادی بلا کی ہے جس کے سہارے جھکنے، برداشت کرنے یا حالات سے سمجھوتہ کرنے جیسے الفاظوں کا زندگی میں گزرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور رہا۔

چند سال قبل کی بات ہے سب بہن بھائی گھر کی ایک دعوت میں مدعو تھے کہ اچانک کسی بات پر بدمزگی کا آغاز ہو گیا۔ میں نے پہلے تو مصالحانہ انداز اپناتے ہوئے اسے ختم کرنا چاہا مگر دوسری جانب سے اصرار جاری رہا جس پر مزاج میں موجود غصہ اور سختی نمایاں ہوئی جو معاملے کو دگرگوں بنا گئی۔ اس موقع پر والدہ نے کہا کہ ''تم ہر بات پر لڑتے جھگڑتے ہو اور غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے ہو اس لیے تمہارا یہاں رہنا ممکن نہیں، بہتر ہے کہیں اور رہنے لگو۔'' اتنے بڑے فیصلے کو سن کر میں کچھ سہما مگر بہت جلد پھر غصے میں بولا کہ کیا یہ حتمی فیصلہ ہے، وہ تو خاموش رہیں مگر دوسرے بہن بھائیوں نے ان کی تائید کرتے ہوئے مجھے حیران کر دیا۔ مناسب رہتا کہ میں خاموشی اختیار کرتا مگر مصلحت اور معاملہ فہمی مجھ سے دور ہو چکی تھی میں نے بھی برجستہ اعلان کیا ''ٹھیک ہے اگلے تین ماہ میں

آپ سب کی خواہش پوری کردوں گا۔''

رات کو جب میں بستر پر لیٹا تو نیند دور کہیں دور مجھ سے روٹھ کر جا چکی تھی۔ رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ میں کیا کہہ بیٹھا یہ تو گھر کی بات تھی اگر ذرا سی خاموشی اختیار کر لیتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی اور پھر اگر انہوں نے کہہ بھی دیا تھا کہ گھر سے چلے جاؤ تو جواب میں اسے منظور کر کے عملی جامہ پہنانے کیلئے مدت معین کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک خیال آتا کہ رات گئی بات گئی، کون مجھ سے پوچھے گا کہ کیوں نہیں جاتے اور اگر پوچھے گا تو کہہ دوں گا والدین کا غصہ وقتی ہوتا ہے۔ کون اسے دل سے لگائے بیٹھے رہے۔ مگر پھر خیال آیا کہ نہیں جو کہہ دیا اس پر عمل کرنا ہے، یہ سب متحد ہیں کیونکہ کسی ایک نے بھی اس موقع پر میری حمایت نہیں کی، میں ان کے دکھ درد میں شریک اور ہر ایک کے ساتھ کھڑا رہتا ہوں۔ اپنی معذوری کے باوجود ان پر بوجھ نہیں پھر میں کیوں جھکوں اب تو اس گھر سے نکلنا ہے خواہ کچھ بھی کرنا پڑے، کسی کے ترس کھانے کا انتظار نہیں کرنا۔ رات یوں ہی آنکھوں آنکھوں میں گزر گئی۔ اگلے دن اس چیلنج کو قلب و ذہن میں قبول کر کے روزمرہ مصروفیات میں منہمک ہو رہا۔

اسٹیٹ ایجنسیوں کے چکر لگائے، مکان کرائے پر لینے یا خریدنے کی بابت معلومات چاہیں۔ اپنے پاس موجود سرمائے کا اندازہ کیا کہ زیورات اور کچھ نقد رقم ہے یوں کل اثاثہ ایک لاکھ سے زائد نہ ہوگا۔ قریب کی کسی بستی میں اور دور کی کسی آبادی میں مکان سے فلیٹ تک ہر ایک کی قیمت پوچھی جو پانچ سے آٹھ لاکھ کے درمیان تھی۔ اسی دوران بینک سے قرضہ لینے کا خیال آیا، منیجر سے ملاقات کر کے پوچھا تو معلوم ہوا کہ تقریباً چار لاکھ روپے قرضہ مل سکتا ہے جو اگلے پانچ سال میں دو لاکھ روپے سود کے ساتھ ادا کرنا ہوگا۔ یوں کل آمدنی کا چالیس فیصد قرض کی ادائیگی میں صرف ہو جائے گا۔ پریشانی کے اس دور میں ایک بہی خواہ نے اپنے فلیٹ میں منتقل ہونے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا کہ آپ پہلے رہنا شروع کریں، چھ ماہ بعد اس کی قیمت کا تعین کر کے جو ممکن ہو نقد اور بقیہ اقساط میں ادا کریں۔ بیشتر دوستوں نے جوں ہی یہ خبر سنی کہ میرے تعلقات گھر والوں سے کشیدہ ہیں اور میں مکان کی خریداری کیلئے ان سے قرض مانگ سکتا ہوں کچھ دوریاں اختیار کرنا شروع کیں۔ ان میں سے اکثر وہ تھے جو گزشتہ ایک عشرے سے اکثر و بیشتر مجھ سے رقوم بطور قرض لیتے رہے تھے۔ اس طرح آزمائش کی اس گھڑی میں مجھے لوگوں کی اصلیت جاننے کا موقع بھی ملا۔ بینک سے قرض حاصل کرنے کے بعد زیور فروخت کیے بغیر میری کل جمع پونجی ساڑھے چار لاکھ سے زائد نہ ہو سکی اس موقع پر اسی بہی خواہ نے جو فلیٹ کی پیشکش کر چکا تھا ایک لاکھ روپے بطور قرض حسنہ دیئے۔

جب میرے پاس ساڑھے پانچ لاکھ روپے تھے تو کوئی مکان ایسا نہ ملتا تھا جو اس رقم میں خریدا جا سکے۔ رہ رہ کر خیال آتا کہ والدہ و گھر کے دیگر لوگ ایک بار یہ کہیں کہ تم نے اس دن کی بات کو بلاوجہ انا کا مسئلہ بنا لیا ہے، چھوڑو رنجش کو تم بھی غصے میں تھے اور ہم نے بھی غصے میں کہہ دیا تھا۔ مگر وہ سب

میرے روز وشب اور مکان کی تلاش سے واقف ہونے کے باوجود بڑے خوف زدہ اور ڈرے ہوئے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ انتہائی ضدی اور خودسر ہے ہمارے روکنے پر مزید سختی اس کے مزاج میں در آئے گی اور کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے یہ کہہ بیٹھے کہ تمہارے ساتھ رہنا تو کجا میں تم سے ملنے جلنے اور شکلیں دیکھنے کا روادار بھی نہیں۔ بھائیوں کا رویہ ایسا تھا کہ وہ نہ تو غصہ ہو کر بیٹھے اور نہ مجھے روکنے کی سعی کی، ہاں میرے ساتھ مکان کی تلاش میں شریک ہو گئے۔ ایک دن خبر ملی کہ موجودہ قیام گاہ سے اگلی گلی میں ایک مکان فروخت ہو رہا ہے جو اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ دو خاندانوں کی ضروریات پوری کرتا تھا، اس کی قیمت بارہ لاکھ تھی جسے سنتے ہی ارمانوں پر اوس گر پڑی۔

معذوری میری راہ میں کبھی رکاوٹ نہ بنی، اللہ کا بے حد کرم ہے کہ میں نے جدوجہد کے ساتھ اپنی زندگی میں ناقابل یقین حد تک وہ اہداف حاصل کیے ہیں جو بیناؤں کیلئے بھی ناممکن کہے جا سکتے ہیں۔ اسی ہمت اور حوصلہ مندی کے ساتھ میں نے اس مکان کو خریدنے کا عزم مصمم کیا۔ کچھ غور وخوض کے بعد خیال آیا کہ ہمشیرہ گزشتہ کئی برسوں سے کرائے کے مکانوں میں آج یہاں کل وہاں رہتی ہے۔ ایک پلاٹ ان کی ملکیت ہے جس کی مالیت پانچ چھ لاکھ ہو گی مگر اسے بنانے کیلئے سرمایہ ان کے پاس موجود نہیں اور مستقبل قریب میں اس کا امکان بھی نہیں، کیوں نہ اسے اپنا شریک بنا کر مکان خرید لیا جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں شام کے وقت اس کے گھر جا پہنچا۔ خیر خیریت اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کہا۔ ''تم کب تک کرائے کے مکانوں میں سامان ڈھوتی پھرو گی، اپنا گھر کیوں نہیں بناتیں'' بولی۔ ''آپ تو ایسے پوچھتے ہیں جیسے ہمارے حالات سے واقف نہیں، مکان کوئی باتوں سے تو بن نہیں جاتا، پہلے کچھ رقم پس انداز ہو جاتی تھی جو اب اخراجات جاریہ کے طور پر مکان کے کرائے میں صرف ہو جاتی ہے۔ اللہ پر بھروسہ ہے وہی بنوائے گا کب اور کیسے نہیں معلوم'' ذرا سنبھل کر بولی ''آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں، میں تو کہتی ہوں آپ بھی بلاوجہ اس دن کی بات کو انا کا مسئلہ بنا بیٹھے ہیں، سچ کہیں کیا پھر کسی نے آپ سے مکان سے چلنے جانے کو کہا، غصہ تھوکیے، خاموشی سے مل جل کر رہیے سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے بڑی مایوسی سے کہا۔ ''یہ تو درست ہے کہ کسی نے دوبارہ نہیں کہا مگر کسی نے روکنے کی بات بھی نہیں کی، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ میں مکان کی تلاش میں مصروف ہوں، کاش! کوئی یہ کہتا ''.....وہ بولی ''سچ یہ ہے کہ سب آپ سے کہتے ہوئے ڈرتے ہیں مگر دل سے کوئی نہیں چاہتا کہ آپ گھر سے چلے جائیں۔'' میں نے کہا ''چھوڑو اس بات کو میرے پاس ایک تجویز ہے ذرا غور سے سنو! اپنی گلی میں ایک مکان بک رہا ہے اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم مل کر خرید سکتے ہیں، دو حصوں پر مشتمل ہے ایک میں تم رہنا اس طرح تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور میرا بھی۔'' وہ حیران ہو کر بولی۔ ''مگر پیسے کہاں سے آئیں گے؟'' ''اس کا حل بھی ہے تم اگر پلاٹ بیچ دو تو اس سے حاصل ہونے والی رقم اور میرے پاس موجود رقم سے یہ مکان باآسانی خریدا جا

سکتا ہے۔''

اگلے دن ناہید اپنے شوہر کے ہمراہ گھر آئی اور والدہ اور بھائیوں کے سامنے میری تجویز رکھی، سب نے اس کی تائید کی جس کے بعد اس مکان کا بیعانہ دے کر پلاٹ فروخت کرنے کی کوشش کی گئی جو اگلے چند روز میں بارآور ثابت ہوئی جس کے بعد رقم کی ادائیگی کے ساتھ ہی مکان کا قبضہ مل گیا۔ کچھ مرمت کے بعد پہلے بہن اور چند دن بعد میں اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ نئے مکان میں منتقل ہو گیا۔ اس وقت چند موقع پرستوں نے مجھے بہکانہ شروع کیا کہ تم جس مکان کو چھوڑ رہے ہو وہ تمہارے والد کا ہے تم وراثت کا حصہ تو حاصل کر لو۔ دو ایک نے تو یہاں تک مشورہ دیا کہ جس کمرے میں رہتے ہو اسے مقفل کر جاؤ تا کہ قبضہ اور دعویٰ باقی رہے مگر جہاں میرے مزاج میں سختی، غصہ اور خودسری ہے وہیں شاید افہام وتفہم کا مادہ بھی موجود ہے۔ میں نے ان سب کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ ''گھر علیحدگی ایک الگ بات ہے اور جب میں گھر میں ہی نہیں تو کمرے پر قبضہ کیا معنی، جو بھائی رہتے ہیں اب ان کا ہے۔'' میں نے یہاں تک صلح جوئی کی کہ کمرے میں لگے پنکھے، ٹیوب لائٹ، بلب اور پردوں کی ریلینگ تک کو بھی نہ نکالا۔

کہنے کو ہم الگ مکان میں منتقل ہوئے مگر نت نئے مسائل سے سابقہ پڑا۔ ہر چیز نئے سرے سے لانی تھی۔ پھر بینک کی قسط کی ادائیگی بھی مشکلات میں اضافے کا باعث بننے لگی، وسائل اور مسائل کے درمیان توازن نہ رہا، یوں مجھے اپنے جی پی فنڈ سے ایک بڑی رقم نکال کر وقتی مسائل حل کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ ایک سال تک تو حالات لشتم پشتم گزرتے رہے، سب ہی گھر والے آتے جاتے تھے، میں بھی عیدالفطر کی نماز کے بعد بیوی بچوں کے ہمراہ والدہ کے گھر آ گیا اور دوپہر تک یہیں رہا، اسی دوران والدہ عارضہ بول میں مبتلا ہو گئیں، دن میں کئی بار ان کی تیمارداری کی غرض سے آنا رہتا۔ ایک روز وہ بولیں، ''تم واپس اسی گھر میں آ جاؤ'' میں نے کہا ''جو ہونا تھا ہو چکا ایک بار جب دراڑ پڑ جائے تو دیوار سلامت نہیں رہتی، اگر آپ کے حکم پر آ بھی جاؤں تو ڈرتا ہوں کہ اب کی بار کسی اختلاف کے نتیجے میں تعلقات کی کشیدگی اس انتہا کو نہ چھو لے کہ ہم ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار بھی نہ رہیں۔'' وہ خاموش ہو رہیں، چند دن بعد یہ خبر ملی کہ پڑوسی اپنا مکان بیچ رہے ہیں۔ سب بھائی مل بیٹھے اور کہنے لگے۔ تم پسند کرو تو یہ مکان تمہارے لیے خرید لیا جائے۔'' میں نے کہا۔ ''سرمایہ کہاں سے آئے گا؟'' بولے تم حامی بھر دو باقی انتظام ہو جائے گا۔'' اور پھر تئیس لاکھ روپے میں یہ مکان خرید لیا گیا اور چند دن بعد ہم اس میں منتقل ہو گئے۔ ہمشیرہ نے کہا۔ آپ اپنا حصہ کرائے پر دے دیں۔ میں یہ کہہ کر چابیاں اس کے حوالے کر آیا کہ تم اس پورے مکان کو استعمال کرو۔ جب میرا گزارا اس حصے میں نہیں ہوتا تو تم نجانے کیسے مشکل میں رہتی ہو گی۔ درمیان کا دروازہ کھول لو اور چاہو تو صحن کی دیوار ہی ہٹوا دو۔ آرام سے رہو۔'' میرے اتنا کہنے کے باوجود بھی وہ کئی ہفتے تک تذبذب کا شکار رہی اور میرے حصے کو استعمال میں نہ لائی۔ مگر پھر دوسرے بھائیوں اور میرے اصرار پر اس نے

اسے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

پڑوسی کے مکان میں شفٹ ہونے کے چند ہفتے بعد والدہ کی علالت مزید بڑھ گئی۔ گردے ناکارہ ہو گئے۔ ڈائیلیسز کی نوبت آئی، خون کی صفائی کا یہ تکلیف دہ عمل تین بار دہرایا گیا۔ چودھویں روزے کی شب ان پر دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا جس کے ساتھ ہی ہم شجر سایہ دار سے محروم ہو گئے۔ اس واقعے کو چار برس ہو چکے آج بھی کبھی ناہید کے ساتھ بیٹھے ماضی کے لمحوں کو یاد کرتے ہیں تو وہ کہتی ہے۔ ''جھگڑا کسی کا ہوا مگر بھلا میرا ہوا، میں کبھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ بس سٹاپ کے اتنے نزدیک مکان خرید سکتی ہوں۔ بس میرے مولا کی کرم نوازی ہے۔'' بڑے بھائی نے کہا۔ ''بات کچھ یوں ہے کہ جب نیت صاف ہو تو اختلاف میں بھی بھلائی کا پہلو نکل ہی آتا ہے۔'' ہم دونوں یک زبان بولے۔ ''بے شک آپ نے درست کہا۔''

☆☆☆

وہ تنہا کمرے میں شکستہ دل کے ساتھ اپنی محبت کی ٹوٹی کرچیاں چُن رہا تھا۔ ہر شے تاریک سی ہوگئی.....اس کے دل کی طرح!

امینہ بتول

زندگی خوبصورت ہے

اسکی آنکھوں میں اڑتے جگنو ایک دم سے غائب ہو گئے۔ دھڑکنوں کا ردھم بے ترتیب ہو گیا اور اسے لگا کہ وہ ایک ٹوٹا پھوٹا، ہارا ہوا انسان ہے۔ ملگجے کپڑوں میں ملبوس کئی گھنٹوں سے بغیر کچھ کھائے پیئے وہ ساکت پڑا تھا۔ اس نے دروازہ لاک کر رکھا تھا۔ محبت کے زخم بے حد تکلیف دہ ہوتے ہیں! ان زخموں کے کوئی پھاہے، کوئی مرہم نہیں ہوتی، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ناسور کا روپ دھار کر سوہانِ روح بن جاتے ہیں۔ یہ بات ایک دفعہ اس نے کسی دوست کے منہ سے سنی تھی اور تب وہ یقین نہیں کرتا تھا مگر اب کر چکا تھا۔

چند لمحوں بعد اس نے ایک سگریٹ سلگایا اور ہر کش کے ساتھ اسکے لبوں سے دھویں کے عجیب مرغولے بننے لگے۔ تمبا کو اور نکوٹین کی تلخی اپنے اندر اتارتے ہوئے پہلی بار اسے شدید قسم کا اچھو لگا۔ وہ سموکنگ کا ہرگز عادی نہیں تھا۔ سگریٹ کا یہ پیکٹ درحقیقت دوستوں کی عنایت تھی جنہوں نے کل شام اسے تھماتے ہوئے کہا: ''بس یار صرف ایک سوٹا اور پھر ہر کش کے ساتھ اپنا غم دھواں دھواں کر کے اگلتے رہنا۔''

اور محبت کا مارا انسان دراصل لوگوں کے لئے پگھلا ہوا مائع وجود ہوتا ہے جس کو وہ اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ جب محبت جیسی خطرناک شے کہیں انسان کے وجود میں ٹھکانہ کر لے تو بس پھر جذبوں پہ قابض ہو کر اسکی ذات کی فاتح بن کر اس سے ہر اختیار چھین لیتی ہے۔

''کتنی خودغرض ہوتی ہے یہ محبت! سفاک محبت! جیتے جاگتے انسان کو مار ڈالتی ہے، اپنا محکوم کر لیتی ہے اور جب وہ خالی ہو جائے تو زمانے کے رحم و کرم پہ چھوڑ کر خود تماشا دیکھتی ہے۔ یہ ہے محبت کا دوسرا چہرہ..... محبت کا ظالم چہرہ.....'' وہ نفرت سے سوچ رہا تھا۔ بری مشکل سے گلاس میں پانی ڈال کر اس نے چند گھونٹ حلق میں انڈیلے۔ اعصاب پرسکون ہونے لگے۔ سرخ نیم وا آنکھوں میں نشہ کچھ اور گہرا ہو گیا۔

اس نے دوسری سگریٹ سلگائی اور ہونٹوں میں دبالی۔ پہلے والی کیفیت کچھ زائل ہو گئی۔ وہ اپنے غم سے وقتی طور پر آزاد ہو کر محبت کو لعن طعن کرنے لگا۔

''گھٹیا شے، بندے کو کہیں کا نہیں چھوڑتی..... جسے میں محبت سمجھ کر پوجتا رہا، وہ محض سراب تھا، ایک کھیل تھا میرے ساتھ..... ایک دھوکہ، فریب.....''

''آئی ہیٹ یو سارہ..... آئی ہیٹ یو.....'' وہ ہذیانی انداز میں چیخا۔ ایک سیل رواں تھا جو آنکھوں سے بہنے لگا۔

محبت اگر میرے سامنے کسی روپ میں آجائے تو میں اس کا گلہ دبادوں گا۔

''کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا .....کیوں.....؟''اس کے بے ربط جملے گونجنے لگے۔

اس نے غصے سے میز پر پڑا گلدان دیوار میں کھینچ کر مارا جو چکنا چور ہوگیا۔اب وہ کمرے کی مختلف چیزیں اٹھا کر پھینک رہا تھا۔

یہ اسکی نفسیاتی توڑ پھوڑ کی عکاسی تھی۔ پھر وہ اپنی الماری سے مختلف چیزیں ٹٹولنے لگا۔ پرانے کارڈز، پرفیوم، ڈائریاں.....مختلف چیزیں اٹھاتے اور ان کی جگہیں بلاوجہ تبدیل کرتے ہوئے وہ بالکل مجنوں معلوم ہورہا تھا۔

کچھ دیر بعد سترہ اٹھارہ سالہ اس نوجوان نے دراز میں سے سٹیل کا نیا بلیڈ نکال لیا۔ وہ غور سے اسکی تیز دھار دیکھتا رہا۔ پھر آنکھیں بند کرلیں اور ہونٹ بھینچ کر نہایت سرعت سے بائیں کلائی پہ بلیڈ پھیر دیا۔خون کی ایک موٹی دھار بازو سے پھوٹ پڑی۔ وہ تکلیف سے کراہا، اسکا سر چکرایا اور بے دم ہو کر قالین پر گر پڑا.....

ڈاکٹر برہان رات پونے گیارہ بجے اپنی ڈیوٹی ختم کر چکے تھے۔ یہ وقت ان کے آرام کا تھا جب ایک نرس نے ایمرجنسی کیس کی اطلاع دی۔ وارڈ میں فی الحال دوسرا ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ وہ فوراً زخمی کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ ایک انسان دوست اور فرض شناس نوجوان ڈاکٹر تھے جنہوں نے مسیحائی کا پیشہ خدمت کے نقطہء نظر سے اپنایا تھا اور یہ خاص رب کی دین تھی کہ ان کے ہاتھوں میں شفا تھی۔سٹریچر پہ ایک نوعمر لڑکا بے سُدھ لیٹا تھا اور اسکی کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔ اسکے والدین نہایت گھبراہٹ اور پریشانی میں تھے۔ ماں اپنے لختِ جگر کے بازو پہ دوپٹہ لپیٹتے ہوئے رو رہی تھی۔

ڈاکٹر برہان ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسکی ٹریٹمنٹ میں مصروف ہوگئے۔ کچھ دیر کی محنت سے خون تو بند ہوگیا مگر زیادہ مقدار میں بہنے سے لڑکا بدستور بے ہوش تھا۔ تاہم انہیں پوری امید تھی کہ وہ اس کی زندگی بچالیں گے۔ اچھی طرح سے مرہم پٹی کر کے انہوں ڈرپ لگائی اور نرس کو ہدایات دے کر اپنے کمرے میں آگئے۔

اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔ وہ بے حد نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے گرد وپیش کا جائزہ لیا تو کچھ سمجھ نہ پایا۔

ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ ماحول پہ ایک سناٹا چھایا تھا۔ بے اختیار اسکی نظر اپنی کلائی پہ پڑی جو دوائی لگی سفید پٹی میں جکڑی ہوئی تھی۔ بازو میں ڈرپ کی سوئی پیوستہ تھی۔ جسکا محلول قطرہ قطرہ اسکے وجود میں داخل ہو کر اسے زندگی بخش رہا تھا۔ اسے وحشت ہونے لگی۔ حواس کچھ بحال ہوئے تو ذہن میں بھونچال سا اٹھا۔ بلیڈ کی دھار نظروں کے سامنے آگئی۔ اس خون کی آلود کلائیاں.....اور پھر یہ معمہ بھی حل ہوگیا کہ وہ کہاں موجود ہے اور کیوں ہے۔ وہ چیخنے لگا۔ نرس فوراً لپکی''آپ ٹھیک تو ہیں؟ کیا ہوا؟''وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر لڑکا کسی طرح قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اسے ڈرپ سے

وحشت ہورہی تھی اور وہ زندگی سے بری طرح نفرت کررہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب، پلیز جلدی آئیں۔آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے مگر وہ بہت عجیب حرکتیں کررہا ہے۔''نرس کی گھبرائی آواز پہ ڈاکٹر برہان چونک گئے۔وہ کسی مریض کا کیس پڑھ رہے تھے مگر اس وقت موقوف کرتے ہوئے نرس کے ساتھ چل پڑے۔

''جنٹلمین، کیسا محسوس کررہے ہیں آپ؟''نوجوان پہ جھکتے ہوئے انہوں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔وہ کچھ نہیں بولا محض چھت کو گھورتا رہا۔اسکا جی چاہ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جائے مگر جسم میں اتنی بھی توانائی نہیں تھی کہ اٹھ سکتا۔ ڈاکٹر برہان چند لمحے اسکا چہرہ کھوجتے رہے۔وہ الجھن میں مبتلا ہوگئے۔ پورے سات گھنٹے بعد ماں باپ نے اپنے بیٹے کو ہوش میں دیکھا تو کھل گئے،وہ ایک لمحہ بھی سکون سے نہیں بیٹھے تھے اور ڈاکٹر انہیں حتیٰ الامکان تسلی دیتے رہے تھے۔

''تمہارا نام کیا ہے بتاؤ شاباش۔''انہوں نے نرمی سے اس کا گال تھپکا۔وہ چپ رہا۔

''کم آن یار.....اب تم ٹھیک ہو.....کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے کہو.....تم مجھے ڈاکٹر کے علاوہ اپنا دوست بھی سمجھ سکتے ہو۔چلو نام بتاؤ۔''ان کا انداز خاصا مشفق اور دوستانہ تھا۔

''بلال''۔یہ شاید ڈاکٹر برہان کے خاص لہجے کا اثر تھا کہ اس نے آہستگی سے لب کھولے۔

''کیا عمر ہے تمہاری..... ؟اچھا چلو میں guess کرتا ہوں۔تم سترہ یا اٹھارہ سے زیادہ کے نہیں ہو۔ہے نا؟''

''کیوں بچائی آپ نے میری زندگی ڈاکٹر؟''اب کی بار جواب دینے کی بجائے وہ چیختے ہوئے اپنے بازو کی پٹیاں نوچنے لگا۔انہیں فوری طور اس کا یہ عمل سمجھ نہ آیا تاہم انہوں نے لڑکے کی دونوں کلائیاں مضبوطی سے جکڑ لیں۔

''یہ کیا طریقہ ہے بلال؟ کیا زندگی اتنی بے مول ہے کہ تم اسے ایک جھٹکے میں ختم کردو؟''

وہ نڈھال سا ہوکر اسے دیکھنے لگا۔

اتنی دیر میں اسکی والدہ سوپ لے کر آ گئیں۔''سنو بلال، تمہیں چاہے مرنے کا شوق ہو مگر تمہارے ماں باپ یہ صدمہ سہنے کا حوصلہ یقیناً نہیں رکھتے۔انہیں اپنے بیٹے کی ضرورت ہے۔ میں ابھی راؤنڈ پہ جارہا ہوں۔آدھے گھنٹے بعد واپس آؤں گا اور تب تک تم یہ سوپ پی چکے ہو.....سمجھے''انہوں نے فکرمند اور مہربان مسیحا کی طرح ذرا سختی سے کہا۔

اسکی ماں نے اپنے بیٹے کا ماتھا چوما اور خاموشی سے سوپ پلانے لگیں۔ڈاکٹر نے انہیں اشارے سے منع کردیا تھا کہ وہ فی الحال کوئی بات نہ کریں۔غالباً یہ اس کی خودکشی کی کوشش تھی۔ مریضوں کا چیک اپ اور حال احوال دریافت کرکے وہ دوبارہ بلال کے پاس آئے۔اسکی والدہ ایک طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر بلال کو دیکھا۔''اچھا ہوا تم نے سوپ پی لیا ورنہ میں ڈاکٹر ہونے کے ناطے سزا بھی دے سکتا ہوں۔''

لڑکے نے بےزاری سے رخ پھیر لیا۔

''ارے یار اتنا بور پیشنٹ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

میں ہنستا مسکراتا خوش مزاج آدمی ہوں اور مجھے ایسے ہی مریض اچھے لگتے ہیں۔ اب تو تم تیزی سے ریکور ہو رہے ہو۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اللہ نے نئی زندگی دی ہے۔'' انہیں مریض کو خود سے مانوس کرنے میں کافی دیر لگی۔ آخر کار وہ زیادہ مزاحمت نہ کر سکا۔ ان کے سوالوں کے جواب دینے لگا۔ ''بلال اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی؟''

''جی جی، کیا.....'' وہ سٹپٹا گیا۔

''ہاں دیکھو ڈاکٹر سے جھوٹ نہیں بولتے۔ تمہیں کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ ڈپریشن، پریشانی یا جو بھی ہے میں تمہیں اس سے نکال لوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ لیکن کچھ بولو نا..... تمہارے والدین بھی نہیں جانتے کہ تم نے ایسا کس وجہ سے کیا، اور شاید تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کس قدر تکلیف سے گزر رہے ہیں۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ ''وہ، وہ ایک فرینڈ نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔''

''کیا؟'' انہوں نے نہ سمجھے والے انداز میں کہا۔

''ہاں، سارہ تھا اس کا نام۔ وہ میری بہت اچھی دوست تھی۔ کوچنگ سنٹر میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ پھر مجھے اس سے محبت ہوگئی اور ایسے ہی جذبات وہ بھی میرے لئے رکھتی تھی۔ ہم دونوں نے گفٹس کا تبادلہ کیا اور ہمیشہ ساتھ رہنے کا سوچا تھا۔ آپ جانتے نہیں کہ میں نے اسے کتنا چاہا..... پھر ایک دم سے وہ بدلنے لگی۔ مجھ سے کتراتی، میں بات کرتا تو انتہائی بے رخی سے منہ موڑ لیتی۔ تب اس نے مجھے بری طرح جھڑک دیا اور کہا کہ وہ ہمیشہ کے لئے مجھے چھوڑ رہی ہے۔ پھر وہ کوچنگ سنٹر بھی چھوڑ کر چلی گئی اور مجھے ایسے لگا جیسے دنیا اندھیر ہوگئی۔ کوئی رنگ باقی نہیں ..... میں بہت اپ سیٹ ہوگیا تھا۔ اسی لیے میں نے خودکشی کی کوشش کی..... اصل میں مجھے محبت کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ نہیں کرنی چاہیے تھی محبت.....''

''اچھا تو تم یہ کہتے ہو کہ تم نے محبت کی اور بے وفائی ملی اور پھر اس چیز نے تمہیں انتہائی فضول حرکت کی طرف اکسایا اور میں کہتا ہوں کہ تم سے زیادہ بیوقوف شخص کوئی نہیں۔ تمہیں شاید زندگی کی اہمیت کا نہیں پتہ.....'' وہ نہایت سنجیدہ تھے۔

''لیکن سب تو یہی کہتے ہیں نا کہ محبت میں انسان کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اسی لئے مجھے بھی.....'' وہ لڑکا اپنی حرکت پہ کچھ نادم نظر آ رہا تھا۔

''جسے تم محبت کا نام دے رہے ہو وہ صرف ٹین ایج کی وقتی کشش ہوتی ہے۔ تم جیسے بہت سے جذباتی نوجوان محض ان لاحاصل چکروں کے پیچھے اپنی پوری زندگی تباہ کر دیتے ہیں۔'' ڈاکٹر برہان سمجھانے والے انداز میں مخاطب تھے۔ ''دیکھو بلال! یہ اس طرح کی نام نہاد محبت دراصل محبت نہیں۔ بس ایک مشغلہ یا دل لگی ہے اور واقعی رسوائی ہے۔ حقیقت میں محبت ایک نہایت پاک جذبہ ہے۔ مگر نوجوانی کے جوش میں انسان اسے درست طور پر نہیں سمجھتا۔ انسان اور خدا کے درمیان تعلق محبت کی بنیاد پر ہے اور جس چیز کا سرچشمہ رب کی ذات ہو اسے یوں پامال نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تمہیں محبت

دیکھنی ہے تو کاش تم وہ منظر دیکھتے جب تمہارے ماں باپ ساری رات باہر کھڑے تمہارے بچنے کی دعائیں کرتے رہے تھے۔ یہ ہے محبت..... کتنی بار تمہارے باپ نے اپنی خواہشات مار کر تمہاری ضروریات پوری کی ہوں گی۔ یہ ہے محبت.....! کیا تم ان راتوں کے ایک لمحے کا بھی حق ادا کر سکتے ہو جو تمہاری ماں نے صرف تمہارے لیے جاگ کر گزاریں؟ سنو، اسے محبت کہتے ہیں۔ میری بات یاد رکھو..... محبت کوئی گھٹیا یا فضول چیز نہیں یہ تو بہت خوبصورت جذبہ ہے..... کائنات کا سارا حسن اپنے اندر سمیٹے ہوئے .....اسی کی بنیاد پر رشتے آباد ہیں۔ صرف سوچ کا فرق ہے۔ محبت کے بغیر یہ دنیا بے رنگ ہے..... دراصل تم جس عمر سے گزر رہے ہو وہ بہت نازک عمر ہوتی ہے۔ اس میں ہر چیز سہانی اور اچھی لگتی ہے۔ لائف کو انجوائے ضرور کرو لیکن یہ نہیں کہ ہر قسم کا تجربہ کیا جائے یہ آگ سے کھیلنا ہے..... ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ خوبصورت جذبوں کو سامنے لانے کا بھی .....اور یہ بھی مت بھولو کہ زندگی میں کامیابی کا زینہ چڑھنے کی ابتدا بھی اسی عمر سے ہوتی ہے۔ اس قیمتی وقت کو لاحاصل سرابوں میں کھو دو گے تو عمر بھر ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے..... پھر ان جذبوں کو لے کر بیٹھے رہنا..... کوئی توجہ نہیں کرے گا۔'' لحظہ بھر انہوں نے غور سے اسکا چہرہ دیکھا جہاں شرمندگی کے آثار نمایاں تھے۔ ''محبت سفاک نہیں ہے، محبت ظالم نہیں ہے، یہ زندگی سے جڑی ہے اور زندگی بہت خوبصورت ہے بلال! کاش تمہیں اس کی اہمیت سمجھ آجائے'' بے وفائی''، ''ہرجائی'' وغیرہ جیسے الفاظ سے باہر نکل کر سوچو کہ جن بے ثمر باتوں کا جوگ لے کر تم اپنی متاع حیات لٹانے چل پڑتے ہو، وہ کس قدر قیمتی ہے! یہاں ہسپتال میں ہی دیکھ لو۔ کتنے ایسے مریض ہیں جو چند لمحے جینے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ عمر کی نقدی بے مول نہیں ہوتی..... میرا ایک کینسر پیشنٹ ہے جسکی زندگی لحہ لحہ ختم ہوتی جارہی ہے۔ کاش اسکی آنکھوں میں جینے کی امنگ تم دیکھ سکتے! پھر تمہیں احساس ہوجاتا کہ زندگی سستی چیز نہیں ہے اور خودکشی کتنا بڑا گناہ ہے۔ خدارا زندگی کی قدر کرو..... یہ بہت خوبصورت ہے اگر احسن طریقے سے گزاری جائے اور سب سے اہم یہ کہ اپنی زندگی کو دوسرے کیلئے مثال بناؤ کہ یہ وبال نہ لگے۔'' اتنا کہہ کر ڈاکٹر برہان خاموش ہوگئے۔

بلال کسی گہری سوچ میں تھا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈاکٹر، زندگی بہت خوبصورت ہے، بہت زیادہ خوبصورت۔ میں نے بہت بڑی بیوقوفی کی تھی۔''

''اور ہاں'' وہ پھر بولے ''ایسا بوگس ''ایڈونچر'' دوبارہ کبھی مت کرنا..... ورنہ تم بہت سی خوبصورتیوں سے محروم ہوجاؤ گے۔''

خدا حافظ کہتے ہوئے بلال نے ڈاکٹر سے مصافحہ کیا تو اس کی نظروں میں صرف شرمندگی ہی نہیں احسان مندی بھی تھی۔ اور جس وقت وہ اپنے والدین کے ساتھ دھیمے قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اُس کے زرد چہرے پر رونق تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آج ایک مسیحا نے مسیحا ہونے کا حق ادا کیا تھا!

☆☆☆

عشرت سیف

دستِ دعا

زندگی میں طرح طرح کی آزمائشیں آتی ہیں۔لیکن اگر انسان اللہ سے مدد طلب کرے اور اس کی حدود کو توڑنے سے بچے تو اللہ ضرور مدد کرتا ہے۔

یہ 1975 کا واقعہ ہے۔ میرے یہاں چوتھے بچے کی ولادت متوقع تھی اس سے پہلے میرا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ تیسرے نمبر والی بیٹی ذہنی اور جسمانی طور پر معذور ہے جس کی عمر اس وقت دو سال تھی۔

میں چیک اپ کے لئے گئی تو ڈاکٹر نے ہسٹری لینے کے بعد ٹیسٹ لکھ دیئے ٹیسٹ کی رپورٹ دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا کہ آپکا بے بی نارمل نہیں ہوسکتا کیوں کہ انفکشن موجود ہے اور 95 فیصد چانس ہوتا ہے کہ یہ انفکشن بچے کو متاثر کرے گا۔ اس لئے P,N,C ضروری ہے۔

میرے سسرال یا میکے میں دور دور تک کوئی معذور بچہ نہیں تھا۔ میں ابھی سنبھل نہ پائی تھی کیوں کہ دو سالہ بچی چل نہ پاتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ میں اس نئی آزمائش کی آمد سے بہت ڈسٹرب ہوگئی۔ میرا معمول تھا کہ میں جس وقت چیک اپ کے لئے جاتی تو نماز عصر قضا ہونے کا خدشہ ہوتا تھا لہٰذا وہیں سے پڑھ کر آتی تھی۔ اس دن پریشانی میں نماز بھی بھول گئی۔ ابھی بس میں بیٹھنے جارہی تھی کہ سامنے مسجد کو دیکھ کر یاد آیا کہ نماز تو پڑھی نہیں تو نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں چلی گئی۔ نماز پڑھ کر نکل رہی تھی کہ ایک مجذوب فقیر نظر آیا۔ میں نے اس سے دعا کی درخواست کی۔ اس نے دیر تک دعا کی۔

ابھی کچھ قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور میرے شوہر سے کہنے لگا میں بہت پریشان ہوں باجی سے کہیں میرے لئے دعا کریں اور چلا گیا۔ میں نے دل میں اس کے لئے بہت دعا کی اور اپنے لئے بھی۔

گھر آکر سب سے پہلے دارالفتویٰ سے فون کرکے پوچھا تاکہ اطمینان ہوجائے۔ انہوں نے پوچھا کیا بچے کی حرکت شروع ہوچکی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں، انہوں نے کہا کہ چونکہ بچے میں چوتھے مہینے روح پھونک دی جاتی ہے لہٰذا آپ نے اسقاط کروایا تو آپ قاتل لکھی جائیں گی۔ آپ اسے رب کی مشیت سمجھ کر قبول کریں۔ میں نے ایک دو ڈاکٹروں سے اور پتہ کیا لیکن رپورٹ دیکھتے ہی انہوں نے بھی انفکشن کی موجودگی کی تصدیق کی۔ فتویٰ لینے کے بعد میں نے اپنے دل کو مطمئن کرلیا کہ دنیا ہے ہی آزمائش کی جگہ۔ میں رب کی رضا میں راضی ہوگئی۔ اور آنے والی بڑی آزمائش کیلئے خود کو تیار

کرنے لگی۔

ڈاکٹر کے پاس گئی تو ساری بات سن کر انہیں غصہ آ گیااور کہنے لگیں تم پڑھی لکھی نہیں ہو جو فتویٰ لینے پہنچ گئیں؟ میرے شوہر کو جو معذور بچی گود میں لئے ہوئے تھے بہت سمجھایا۔ بصورت دیگر انہوں نے میرا کیس لینے سے انکار کر دیا۔ یہ ہاسپٹل اسٹیل مل کے پینل پہ تھا۔ بہر حال پھر انہوں نے کہا کہ آپ کے شوہر لکھ دیں کہ اس کیس کی کسی خرابی کے ذمے دار آپ خود ہوں گے۔ میرے شوہر نے لکھ دیا۔ لیکن اب بھی وہ یہی سمجھاتی رہی کہ دو معذور بچوں کو سنبھالنا بہت مشکل ہے اور یہ ہم بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ لیکن اللہ سے دعا گو تھے کہ اللہ اس آزمائش سے بحسن وخوبی ہمیں نکال دے۔

اور الحمدللہ اللہ نے پھر مجھے بہت خوب صورت اور بالکل نارمل بیٹی سے نوازا۔ نہ صرف یہ کہ وہ پورے خاندان میں سب سے زیادہ خوب صورت ہے بلکہ ذہین بھی ہے اور سمجھ دار بھی۔

میں سوچتی ہوں اس وقت ڈاکٹر کی بات مان لیتی اور گھبراہٹ میں غلط فیصلہ کر لیتی تو اس کی کس قدر ناراضی کی حقدار ٹھہرتی مگر اللہ نے مجھے اپنی رحمت سے اس آزمائش سے بحسن وخوبی نکال لیا۔

یہ سب گوش گزار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آج کی خواتین اور مائیں اسقاط کو بہت معمولی سمجھنے لگی ہیں۔ حالانکہ یہ صریح گناہ ہے۔

☆☆☆

بشریٰ تسنیم

منزل یہی کٹھن ہے

صبح عادل کے دفتر روانہ ہونے کے بعد حسبِ معمول سب سے پہلا کام حفصہ نے ای میل چیک کرنے کا کیا۔ سامیہ کی ای میل پڑھ کر وہ سخت جھنجلائی ہوئی تھی۔ ''احمق! بھلا یہ کوئی مذاق ہے کرنے والا؟ انسان اس قدر بھی واہیات پنے پہ نہ اتر آئے کہ دوسروں کے بارے میں ایسی خبریں پھیلانے لگے۔'' حفصہ بڑبڑانے کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر بھی بند کر رہی تھی۔

''سامیہ تو ہے ہی ایسی.....'' اس نے کمپیوٹر ٹیبل سے اٹھتے ہوئے سوچا۔ ''اُسے ہمیشہ ایسے لوگوں کی برائیاں تلاش کرنی ہوتی ہیں جن کی دنیا تعریف کرتی ہے۔''

ابھی وہ سامیہ کے خلاف اپنا غصہ نکالنے میں مصروف تھی کہ اُس کی طرف سے موبائل میسج بھی آ گیا جس میں ای میل پڑھ لینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ حفصہ نے جواباً ناراضگی کا میسج بھیجا تو سامیہ نے اُس کو skype پہ آنے کی دعوت دی۔ کام اس قدر پھیلا ہوا تھا، منے کے جاگ جانے کا بھی وقت ہو رہا تھا۔ عادل حلیم کی فرمائش کر گیا تھا۔

اُف یہ عادل کو حلیم کیوں اتنی اچھی لگتی ہے؟ حفصہ نے بیزار سا ہو کر سوچا۔ ہمارے گھر تو کوئی نہیں کھاتا تھا۔ جس دن یہ فرمائش آ جاتی تو حفصہ سخت الجھتی۔ اگرچہ اب وہ کافی طاق ہو چکی تھی اس ''پر تکلف دال'' کے ساتھ نمٹنے میں۔ پھر بھی وہ بہت محتاط رہنے کی کوشش کرتی۔ یہ اس کا تجربہ تھا کہ کھانا پکاتے وقت جو جذبات و احساسات ہوں کھانے پر اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ غصہ، بیزاری، لاپروائی کے ساتھ پکا ہوا کھانا کبھی خوش ذائقہ نہیں بن سکتا۔ محبت، خلوص، توجہ اور خوش دلی کھانے کو وہ طاقت عطا کر دیتی ہے جس سے دل جیتے جا سکتے ہیں۔ معدے سے دل کو جانے والا راستہ دراصل پیار و محبت اور جانفشانی کا احساس ہوتا ہے۔

یہ بات اس کو طیبہ خالہ نے سمجھائی تھی اور اب تین سال کے شادی شدہ عرصہ میں وہ اس کا تجربہ بھی کر چکی تھی۔

طیبہ خالہ کا خیال آتے ہی اس کو سامیہ کی طرف سے آنے والی ای میل پھر یاد آ گئی۔

''میں دیکھوں skype کھول کر..... یا نہیں؟'' اس نے خود کلامی کی۔

''اس سامیہ کی بچی کو کھری کھری سناتی ہوں۔ دل کو اطمینان ہو جائے گا تو کام بھی جلدی سے نمٹ جائے گا۔'' یہی سوچ کر اس نے کمپیوٹر کی طرف قدم بڑھایا۔ پاکستان میں اس وقت صبح کے نو بجے ہوں گے۔ دیوار گیر گھڑی پہ اس وقت دوبئ میں آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کمپیوٹر آن کیا۔ سامیہ جیسے اس کے انتظار میں ہی بیٹھی تھی۔

''کیا بکواس ہے؟ شرم نہیں آتی تمہیں ایسا مذاق کرتے ہوئے؟'' حفصہ اس کو دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔

''نہ بکواس ہے اور نہ مذاق.....'' سامیہ برا ہی مان گئی اور پھر اس نے جو تفصیلات بتانی شروع کیں تو حفصہ کے ہوش اڑ گئے۔

''اچھا۔ اچھا..... اب بند کرو مجھے کام ہے۔'' حفصہ کو کچھ اور نہ سوجھا تو اس سے جان چھڑائی۔ مگر اب وہ بجائے مطمئن ہونے کے اور بھی زیادہ حیران و پریشان ہو گئی تھی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے..... یہ نہیں ہو سکتا!

ہائے طیبہ خالہ! یہ آپ نے کیا کیا۔ وہ خیالوں میں اپنی بہت پیاری طیبہ خالہ سے الجھ رہی تھی۔

وہ بجھے دل کے ساتھ باورچی خانہ میں گئی مگر نہ ذہن ساتھ دے رہا تھا نہ دل۔ بھلا اس طرح کیا پکاؤں گی؟ وہ سنک میں پڑے برتن دھونے لگی۔ برتن دھل گئے مگر اس کا ذہن اور دل صاف نہ ہوا۔ اس کو اپنے کچن کی ہر شے اجنبی سی لگ رہی تھی۔ ہر چیز کے ساتھ دل کے احساس کا رشتہ کیوں جڑا ہوتا ہے؟ سب کچھ بے روح، بے زار، اداس سا لگ رہا تھا۔

''آج میری جو کیفیت ہے اس نے ضرور کچھ گڑبڑ کرنی ہے کھانے کی تیاری کے دوران.....بہتر ہے میں ابھی کوئی کام شروع نہ کروں۔'' حفصہ نے خود کو مشورہ دیا۔

''وقت تو گزرتا جا رہا ہے۔ عادل ٹھیک ڈیڑھ بجے کھانے کے لئے گھر پہنچ جائیں گے اور کھانا نہ بنا تو پھر مزید بدمزگی ہوگی۔'' دوسرا مشورہ خود ہی سامنے آ گیا۔

بے دلی کے ساتھ اس نے الماری سے پیکٹ نکالا۔ اسی دوران دروازے کی گھنٹی بجی۔ تیز آواز سے منا جاگ گیا اور فون بھی اسی لمحے بجنے لگا۔ منتشر ذہن سینیر دآزما حفصہ مزید گڑبڑا گئی۔

اُف! کس کو پہلے دیکھوں.....کیا کروں؟ دروازے پر جاتی ہوں تو اتنی دیر میں منا پلنگ سے نیچے ہی نہ آن گرے۔ منے کو اٹھانے جاؤں تو اتنی دیر میں فون کون اٹھائے؟ فون سننے لگوں تو باہر گروسری والا ہے اس سے کون نپٹے؟ وہ کہیں واپس نہ چلا جائے۔ یہی کچھ اندازے لگاتے اس نے جلدی سے منے کو اٹھایا۔ باہر کا دروازہ کھول کر گروسری کا سامان پکڑا جو اس نے فون پر آرڈر کیا تھا۔ ادھر فون بند ہو چکا تھا۔ گروسری والے سے نمٹ کر اس نے منے کا فیڈر بنایا اور اس کو گود میں لے کر صوفے پر بیٹھ گئی اور پھر گزرے برسوں کی سوچیں خود بخود آتی چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

آج سے پندرہ سال پہلے حفصہ کے والد سہیل احمد خاصے شش و پنج میں مبتلا تھے۔ ان کی کمپنی نے کچھ ملازمین کو تین سال کیلئے بیرون ملک بھیجنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ان میں سہیل احمد کا بھی نام شامل تھا اور ان کو ایک ہفتے کے اندر ہاں یا ناں میں حتمی جواب دینا تھا۔

بیرون ملک جا کر کچھ نیا سیکھنے اور ترقی کے مواقع بہت پرکشش تھے مگر بیوی بچے نہ ساتھ لے جا سکتے تھے اور پیچھے تنہا چھوڑ کر جانے پر بھی دل آمادہ نہ تھا۔ انہوں نے سوچا اپنے قریبی دوست سلمان سے جا کر مشورہ کرتا ہوں۔ اگر بات بن گئی تو بیوی بچوں کو بھی اس سے آگاہ کر دوں گا۔ سلمان سے ملاقات بہت ہی خوش آئند رہی اور ان کے بیرون ملک جانے کا ارادہ حتمی ہو گیا۔ وہ ان مردوں میں سے تھے جو ہر کام پایہ تکمیل تک پہنچا کر گھر والوں کو خبر کرتے ہیں۔ ان کی بیگم ساجدہ سہیل مقامی سکول میں پڑھاتی تھیں۔ دو بچے حفصہ جس کی عمر گیارہ سال اور بیٹا عمیر آٹھ سال کا تھا۔ بچے اسی اسکول میں جاتے تھے جہاں ان کی والدہ پڑھاتی تھیں۔

سہیل احمد کو یقین تھا کہ ان کی بیگم ترقی اور خوشحالی کے اس موقع کو ضائع نہ کرنے دے گی۔ پانچ مرلہ کے معمولی سے مکان میں رہنے والا یہ گھرانہ یقیناً مختصر سے عرصہ کی دوری کو اچھے مستقبل کی خاطر برداشت کر لے گا۔ سلمان نے بھی ان کی خوب حوصلہ افزائی کی اور مشورہ دیا کہ اپنا مکان کرائے پر دے دو۔ اپنی بیوی اور بچوں کو کسی گھرانے کے ساتھ ٹھہرا دو سلمان کی بات سن کر پہلے تو سہیل احمد پریشان ہی ہو گئے۔

''یار! کیسی باتیں کرتے ہو؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟''

''سب کچھ ممکن ہے'' وہ بھی حتمی انداز میں بولے۔

''کیسے؟ کہاں سے ایسی کوئی فیملی جو.....؟ انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سلمان کی آنکھوں میں جھانکا۔

''شام کو بھابھی کو لے آنا۔ میرے ساتھ چلنا، ایک فیملی ہے ایسی جو اپنے گھر کا ایک حصہ کرائے پر دینا چاہتی ہے'' انہوں نے سہیل کی تشویش کو نظر انداز کر دیا۔

سہیل احمد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے دوست کو مشکوک

سا ہو کر دیکھا۔

''تم ایک بار مل کر تو دیکھو بھابھی کو ملوا دو۔ پھر فیصلہ تمہارا اور بھابھی کا اپنا ہوگا۔''

''اچھا'' سہیل احمد نے تھکے تھکے سے لہجہ میں کہا۔''میں کل شام کو تمہاری طرف آجاؤں گا۔''

اگلے دن نئی طرز کے دو منزلہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے سہیل احمد کی ملی جلی کیفیت تھی۔ ان کی بیگم اور دونوں بچے بھی کچھ خاموش سے تھے۔ گھر کے مالک نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ شاید سلمان ان کو پہلے سے اچھی طرح معلومات دے چکے تھے۔

دو گھنٹے کی اس نشست میں فریقین نے ایک دوسرے پر بھرپور اعتماد کا اظہار کیا۔ ان کی دو بیٹیاں ہاجرہ اور فاطمہ، حفصہ کی تقریباً ہم عمر تھیں۔ جلدی ہی بچوں میں خوب دوستی ہوگئی۔

''ہمیں ایسے گھرانے کی تلاش تھی جو قابل اعتماد ہو اور ہمیں سلمان بھائی پہ پورا بھروسہ ہے۔'' طیبہ نے بیگم سہیل کے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

ساجدہ نے ان کی بات پہ خوش دلی کا اظہار کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا کہ آپ نے ہمیں اعتماد کے قابل سمجھا۔

ساجدہ نے بھی طیبہ کو بہت باوقار، سلجھی ہوئی ، دوراندیش خاتون محسوس کیا۔ ادھر مردوں میں بھی خاصا دوستانہ ماحول رہا۔

دو تین دن سوچ بچار کرنے کے بعد سہیل اور ساجدہ نے فیصلہ کیا کہ کمال صدیقی کے اوپر والے حصہ میں شفٹ ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہاں سے ساجدہ کا سکول بھی نزدیک تھا۔ بچوں کے اکیلئے رہنے کی پریشانی بھی نہ تھی۔ گھر میں ایک مرد کی سربراہی بھی موجود تھی۔ کمال صدیقی اور طیبہ دونوں بہت منفرد سے انسان تھے۔

طیبہ کمال بھی یہی چاہتی تھیں کہ انکی بچیوں کی ہم عمر اور ساتھ کی لڑکیوں والا کوئی گھرانہ ہوتا کہ ملنے جلنے میں آسانی ہو، معاملات کا جھنجھٹ ضرورت سے زیادہ نہ ہو۔

سہیل احمد کی روانگی سے ہفتہ پہلے ساجدہ اپنے دونوں بچوں سمیت طیبہ کے گھر کے اوپر والے حصہ میں شفٹ ہوگئی۔ بچوں کی تو دوستی ایک گھنٹے میں ہی ہوگئی تھی۔ ساجدہ کے معمولات متعین تھے۔ سکول جانا، واپس آکر بچوں کو پڑھانا، کبھی کاپیاں چیک کرنا، کبھی پیپرز تیار کرنا یا چیک کرنا۔ زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔ حالات کیسے ہی ہوں وقت کا دھارا اپنی راہ چلتا رہتا ہے۔ طیبہ اب بچوں کی ''طیبہ خالہ'' ہوگئی تھی۔ طیبہ اور اس کے شوہر نے اس گھرانے کا بہت خیال رکھا۔ چند ہفتوں بعد ساجدہ نے محسوس کیا کہ وہ بہت ذہنی سکون محسوس کر رہی ہے۔ طیبہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ ساتھ اس کے بچوں پر بھی خاص نظر شفقت رکھتی اور اچھی تربیت کر رہی ہے۔

حفصہ اپنی طیبہ خالہ سے کچھ زیادہ ہی مانوس تھی۔ وہ ان کی ہر بات کو غور سے سنتی۔ ان کے ہر عمل کو نقل کرنے کی کوشش کرتی۔ طیبہ خالہ اس کی آئیڈیل بنتی جا رہی تھیں۔ وہ کون سا چھوٹا یا بڑا مسئلہ تھا جس کا حل ان کے پاس نہ ہوتا تھا۔ نصیحت کرنے کا اتنا خاص انداز تھا ان کا، کہ حفصہ اس کے بارے میں بہت حیران ہوتی، معلوم ہی نہ ہوتا کہ کوئی ان پر کوئی بات مسلط کر رہا ہے یا ان کو کچھ غلط کہہ رہا ہے اور تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ننھی حفصہ اب بڑی ہو رہی تھی۔ انہوں نے چپکے چپکے بہت پیار اور شفقت کے ساتھ کچھ عرصہ بعد لڑکیوں میں ہونے والی حتمی تبدیلیوں کا بھی ذکر کان میں ڈال دیا۔ ایسے کہ جیسے یہ کوئی اچنبھے والی بات نہ ہو، زندگی کا ایک حصہ ہو۔ اس دن حفصہ کے دل میں طیبہ خالہ کی عزت اور محبت دونوں بہت بڑھ گئیں واقعی وہ اس کو ہاجرہ اور فاطمہ سے کسی طور پر کم نہ سمجھتی تھیں۔ اس عمر میں وہ تینوں کو خاص ڈیزائن کے فراک بنا کر دیتیں جس کے گلے کا ڈیزائن لمبی لمبی جھالروں والا ہوتا اور وہ خود کو بہت معتبر اور محفوظ سا محسوس کرتی۔ پھر انہوں نے ہی تینوں بچیوں کو سکارف اوڑھنا سکھایا جس کے ذریعے انہیں بہت کچھ نیا سمجھنے کو ملا۔

تین سال گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ سہیل احمد اور کمال صدیقی کے درمیان بھی اس عرصہ میں رابطہ رہا اور طیبہ اور ساجدہ کی دوستی

بہناپے میں مضبوط ہوتی گئی۔بچوں کی باہمی دوستی نے ان دونوں گھرانوں کو مزید قریب کردیا۔اسی سارے تناظر میں کویت سے واپس آکر سہیل احمد نے اپنا پانچ منزلہ مکان فروخت کرکے اور وہاں سے لائی ہوئی رقم ملاکر دس مرلے کا مکان کمال صدیقی کے نزدیک ہی خریدلیا۔

زندگی اس اعتماد،محبت کے جھولے پہ جھولتی گزرنے لگی۔حفصہ اور طیبہ خالہ کی باہمی محبت کا رنگ بھی وقت اور عمر کے ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا۔حفصہ طبعاً نیک فطرت لڑکی تھی۔طیبہ نے اس کو اپنی دونوں بیٹیوں کے برابر جانا اور بہت سے معاملات میں اپنی دونوں بیٹیوں سے زیادہ شعور وفہم والا پایا۔

طیبہ خالہ کو بھی حفصہ نے زندگی کے ہر موڑ پر بہترین مشیر،راہبر جانا۔اسکول ہو یا گھر حفصہ کی ہر بات طیبہ خالہ کے ذکر سے شروع ہوتی اور ہر کام میں ان کی باتوں کا حوالہ ضرور ہوتا۔اسکول اور پھر کالج میں کوئی مشکل مسئلہ ہوتا،کوئی دینی مسئلہ ہوتا حفصہ سب کو مطمئن کردیتی۔

''کوئی مسئلہ نہیں،میں کل طیبہ خالہ سے پوچھ کر آؤں گی۔''

حفصہ کی کلاس فیلوز،ٹیچرز،کزنز سب اسکی اس عادت سے واقف تھیں۔کبھی کبھار اس قدر تذکرہ کرنے پر بدمزگی بھی ہوجاتی تھی۔مگر سب تسلیم بھی کرتے کہ طیبہ کمال واقعی کمال کے مشورے دیتی ہیں اوران کے پاس ہر مشکل مسئلے کا آسان حل موجود ہے۔

وہ دن کسی اچنبھے سے کم نہ تھا جب طیبہ خالہ نے نوعمر لڑکیوں کو محرم اور غیر محرم رشتوں کی پہچان کرائی۔اور بتایا کہ یہ ایسے ہی فرض ہے جیسے نماز،روزہ.....اس کے بعد ہاجرہ اور فاطمہ نے حفصہ کے بھائی کے ساتھ بے تکلف ملنا چھوڑ دیا اگرچہ وہ عمر میں ان سے چھوٹا تھا۔اور حفصہ نے کمال صدیقی انکل کے کندھے پر لٹک لٹک کر فرمائشیں نہ کیں حالانکہ وہ اس کے باپ کے برابر تھے۔

میڈیا کے ذریعے پھیلتی بے راہ روی کا ان کے پاس ایک ہی حل ہوتا تھا کہ نوجوان بچوں کو ان حدود قیود کا صحیح ادراک دیا جائے جن سے معاشرے میں سکینت نازل ہوتی ہے۔

بطور ٹیچر ساجدہ کا واسطہ نوعمر بچیوں سے رہتا تھا۔وہ اکثر نت نئی کہانیاں اور واقعات آکر سناتی جو اسکول کے سٹاف روم میں سننے کو ملتی تھیں اور وہ دونوں کسی حل کی طرف پیش قدمی کرنے کیلئے ایک دوسرے کو مشورے دیتی تھیں۔شب وروز کے کھیل میں وہ دن بہت ہی بھاری تھا جب غم کا کوہ گراں طیبہ خالہ پر آن گرا مگر وہ بہت صبر،تحمل سے اس کو سہہ گئیں۔ایسا صبر وتحمل جس میں ایک وقار کی شان بھی تھی اور اپنے رب کے فیصلے پر مکمل راضی رہنے کا مان بھی تھا۔کمال صدیقی صبح دفتر ہنستے مسکراتے روانہ ہوئے مگر واپسی پہ روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں ایمبولینس میں لائے گئے۔اب وہ کمال صدیقی نہ تھے بس ایک خالی پنجرہ تھے جس میں روح کا پرندہ اپنے خالق کے حضور حاضر ہوچکا تھا۔پیچھے رہ جانے والے پنجروں میں مقید پرندے پھڑ پھڑا رہے تھے۔جیسے کمال صدیقی کے پرندے کے ساتھ ہی آزاد ہونا چاہتے ہوں۔مگر آزادی کا پروانہ اپنے اختیار میں نہیں دیا گیا۔یہ بھی قانون فطرت ہے کہ روح کتنی ہی بے قرار ہوکر جسم سے نکلنا چاہتی ہو۔مگر اپنے وقت مقررہ کے آنے تک اسکے اندر ٹھہراؤ آہی جاتا ہے۔ایسا نہ ہوتا تو ایک پرندے کے آزاد ہونے پر باقی رہ جانے والوں کا جو عالم ہوتا ہے کوئی بھی ''آزاد'' ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔مگر سچ ہے کہ موت جتنی تلخ حقیقت ہے،انسان اس سے اتنا ہی جلدی غافل بھی ہوجاتا ہے۔شاید دنیا کی گاڑی چلتے رہنے کیلئے یہ نسیان بھی اللہ نے ہی رکھ دیا ہے۔ورنہ تو سب مرنے والوں کے ساتھ ہی مرجائیں!

طیبہ نے عدت میں اپنے بھائی کو گھر بلوالیا تھا۔دونوں بیٹیوں کے ساتھ گھر میں بغیر محرم کے رہنا مشکل تھا۔زندگی کے دریا کا رخ اچانک بدل گیا تھا۔نئے مسائل اتنے گھمبیر تھے یا پھر زندگی کا ساتھی چلے جانے سے وہ اتنے زیادہ محسوس ہونے لگے تھے۔انسان اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہے جو بہترین ساخت پر پیدا کی گئی ہے۔اس لئے اس بہترین خالق کے

بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے بد سے بدترین حالات میں بھی بہترین راہیں مل ہی جاتی ہیں۔طیبہ کو یہ راہیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔وہ ہر معاملہ میں اپنے اللہ سے یوں گفتگو کرتیں جیسے اس کے وجود کو سامنے دیکھ رہی ہوں۔ باہم گفتگو کے بعد وہ محسوس کرتیں کہ وہ تنہا نہیں ہیں،ان کا ہاتھ ایک ایسی مختارِ کل اور قادرِ مطلق ہستی کے ہاتھ میں ہے جس کے ہاتھ کی گرفت ان کو دنیا کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پہ جانے سے روک لیتی ہے اور اس مہربان ہستی کی مہربان انگلی پکڑ کر خواہشاتِ نفس کے میلے میں گم ہونے کا خوف نہیں رہتا۔

کمال صدیقی کی بیوہ کو ان کی کمپنی نے فنڈز وغیرہ بغیر کسی تردد اور غیر ضروری انتظار کے ادا کر دیئے۔ یہ رقم انہوں نے کمال کے بھائیوں سے مشورہ کر کے اپنے بھائی کے کاروبار میں شراکت کے لئے جمع کرادی۔

زندگی کی گاڑی وقت کی پٹڑی پہ رواں دواں رہی جیسے مسافروں کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وقت کی پٹڑی نے کب گاڑی کو دوسرے ٹریک پر ڈال دیا ہے۔کائنات کا مالک بھی ہر مخلوق کے معاملات کو اسی طرح ایک سے دوسرے ٹریک پر ڈالتا اور الٹ پھیر کرتا رہتا ہے۔ صرف ہوش وخرد والے ہی ان کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔گاڑی کے مسافر متعین ٹریک کو نہیں بدل سکتے۔اسی طرح کوئی بھی ذی روح اپنے حصے کے متعین ٹریک کو نہیں بدل سکتے۔اکثر محنتیں بے ثمر ہوتی ہیں۔اور بہت مرتبہ بغیر کوشش کے بادشاہت تک مل جاتی ہے۔طیبہ کو اس ذات کے قادرِ مطلق ہونے پر بھرپور یقین تھا اسی لئے وہ بے محابا سوچوں میں الجھنے سے بچی رہتی۔''کہیں ایسا نہ جائے، کہیں ویسا نہ ہوجائے'' کے غیر ضروری امکانات کو دردِ سر نہ بناتی۔

اگلے چند سالوں میں ہاجرہ اپنے گھر کی ہوگئی۔چھوٹی بیٹی فاطمہ کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اس کے مجوزہ رشتوں پہ غور وفکر ہونے لگا۔کسی بھی رشتے پر طیبہ کا دل مطمئن نہ ہو رہا تھا اور اس کی وجہ اس وقت اس کو سمجھ آئی کہ قدرت نے تو کچھ اور فیصلہ کر رکھا تھا اور اس کے لکھے فیصلے کو دنیا کی کوئی بھی طاقت چیلنج نہیں کر سکتی۔شادی کے ڈیڑھ سال بعد ہاجرہ زچگی کے کٹھن مرحلے کے دوران زندگی کی بازی ہار گئی۔جبکہ اس کی نشانی ننھی سی پری فاطمہ میں ماں کا وجود پانے کی منتظر تھی۔قدرت کا یہی فیصلہ تھا کہ فاطمہ اپنی بہن کا خلا پر کرے۔

حفصہ اور فاطمہ کا نکاح ایک ہفتے کے فرق سے انجام پایا۔ فاطمہ اپنے گھر روانہ ہوئی جہاں ساس،سسر اور ایک بچی کا باپ اس کا منتظر تھا اور حفصہ چند ہفتوں بعد دوبئ آ گئی۔

☆.....☆.....☆

دروازے پر بجتی گھنٹی کی آواز سے سوچوں میں گم حفصہ اتنی بری طرح چونکی کہ اس دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔مناماں کی گود اور فیڈر کی رفاقت پا کر گہری نیند میں تھا۔حفصہ نے آہستہ سے بچے کو صوفے پر لٹایا اور گھڑی پہ نگاہ پڑتے ہی اس کے حواس گم ہوگئے۔ عادل کے آنے کا وقت ہوا چاہتا تھا اور کھانے کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔سراسیمہ سی حفصہ نے جا کر دروازے پہ دیکھا۔باہر کوئی نہ تھا۔ البتہ بجلی، پانی کا بل دروازے کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔

''اُف! اب کیا ہوگا؟ اس نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔رات کا بھی کچھ کھانا نہیں پڑا اور عادل صاحب تو حلیم کے خیالوں میں منہ میں پانی بھرے آتے ہوں گے۔یا اللہ! میری مدد فرما۔اپنی قدرت سے کوئی اس مسئلے کا حل نکال دے۔'' وہ عادل کی خفگی برداشت کرنے کی متحمل نہ ہو پاتی تھی۔وہ جتنا بھی اچھا ہو جائیں بھوک برداشت کرنے کے معاملے میں بالکل صفر ہیں۔

''یا اللہ! آپ میری قلبی حالت کو بھی جان سکتے ہیں بلکہ آپ ہی جانتے ہیں اور میری اس وقت کی پریشانی کا مداوا بھی آپ ہی کے پاس ہے۔'' مارے رقت کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''اللہ جی، پیارے اللہ جی! مسئلہ چھوٹا ہے، مگر میرے لئے اس وقت بہت بڑا ہے۔اس وقت کوئی نہ میری حالت کو جان سکتا ہے نہ کوئی میری مدد کر سکتا ہے۔'' اس وقت وہ طیبہ خالہ کی خبر کو بھی بھول بیٹھی تھی جس نے اس کو بے چین کر رکھا تھا۔وہ خوامخواہ ادھر ادھر ہاتھ مار رہی تھی۔کہاں سے کام شروع کرے؟ اس د

ران اس کا موبائل بجنے لگا۔

اُف! عادل کی کال ہے۔ضرور وہ کسی دوست کو ساتھ لا رہے ہوں گے حلیم کھلانے کو..... وہ بالکل رونے والی ہو رہی تھی۔'سلام دعا کے بعد عادل نے جب کہا کہ'میں کھانے پر نہیں آؤں گا۔کچھ ضروری کام ہے آفس میں'' تو مارے محبت اور تشکر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔''پیارے اللہ میاں! آپ واقعی التجاؤں کو سنتے اور قبول کرتے ہیں..... پکار کا فوری جواب دیتے ہیں۔'' اور ساتھ ہی اس کے کانوں میں طیبہ خالہ کی آواز گونجی۔''یہ تو پکارنے والے کا جذبہ متعین کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کو کیسا پکارتا ہے۔جواب اسی کو ملتا ہے جو پکارنے پر جواب کا یقین بھی رکھتا ہو۔'' طیبہ خالہ آپ نے بالکل سچ کہا تھا، وہ مسکرائی۔

''دل سے پکارو یقین کامل کے ساتھ وہ رب تو دل ہی میں رہتا ہے۔دل کی بات اس ذات سے بہتر کون جان سکتا ہے۔'' حفصہ خود کو ایک دم فارغ اور ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگی۔رات سات بجے تک وہ آرام سے اپنے کام سمیٹ سکتی تھی۔نئی پریشانی اور مشکل میں پرانی پس منظر میں چلی جاتی ہے۔اب اس سے نکلی تو حفصہ کو سامیہ کی باتیں یاد آنے لگیں اور یہ فکر ستانے لگی کہ وہ عادل کو یہ بات کیسے سنائے گی۔وہ کتنا مذاق اڑائیں گے۔میری طیبہ خالہ کو کتنا برا کہیں گے۔انہوں نے کیا بھی تو برا ہے، برے کو برا ہی کہا جائے گا۔مگر مجھے کتنی خفت ہوگی۔میں جوان کی ہر بات میں مثال دیتی ہوں۔وہ گھر کے کام کاج کرتے، منے کی ساری ضروریات کو پورا کرتے مسلسل سوچوں میں گم تھی۔

''پاکستان میں لوگوں نے کیا کچھ نہیں سوچا ہوگا۔کتنی باتیں بنائی ہوں گی۔کتنے طعنے دیئے ہوں گے۔مگر یہ کیوں ہوا؟ کیا وجہ ہوئی ہوگی۔طیبہ خالہ کو آخر یہ کیا سوجھی؟ ہوسکتا ہے کچھ غلط بیانی کی ہو سامیہ نے، بات کچھ ہو اور اس نے اور بنالی ہو۔'' حفصہ نے خود کو بہلانے کی کوشش کی۔''ہاں! سامیہ تو ہمیشہ سے چڑتی تھی اس گھرانے سے مگر وہ اتنی بڑی بات تو نہیں بنا سکتی۔میں فاطمہ کو فون کر کے پوچھتی ہوں۔ ان کے گھر کمپیوٹر تو ہے مگر انٹرنیٹ کی سہولت نہیں ہے۔skype سے کتنی آسانی رہتی ہے۔'' اس نے بستر کی چادر بدلتے ہوئے یہ سب سوچا مگر وہ عادل کے آنے تک فاطمہ کو فون بھی نہ کر سکی۔وہ یہ ہی سوچتی رہی کہ آخر وہ اس سے کیا پوچھے گی؟ اس کا دل پھر رنج سے بھرنے لگا۔روح پژمردہ ہونے لگی دل پہ انجانا بوجھ تھا جو اسے اداسی کی گہری دھند میں لپیٹے جا رہا تھا۔وہ طیبہ خالہ سے خفا تھی، یا دنیا سے جو طیبہ خالہ کے بارے میں چہ می گوئیاں کر رہے ہوں گے۔یا دونوں سے خفا تھی جو کچھ بھی تھا۔وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی اور عادل کا سامنا کرنے کے خیال سے گھبرا بھی رہی تھی۔وہ ایک لمحے میں اس کی پریشان طبیعت اور بے قرار کیفیت کو جانچ لینے کا ماہر تھا اور حفصہ بھی جب تک اپنے شوہر کے سامنے ہر بات کھول کر نہ رکھ دیتی سکون نہ مل سکتا تھا۔

''مگر کیا وہ اس بات کو عادل سے کہہ کر اپنا مذاق بنوائے گی اور طیبہ خالہ کی شخصیت کا جو پرتو اس نے عادل پہ ڈال رکھا ہے اس کا کیا ہوگا؟'' حفصہ اس ادھیڑ بن میں مصروف تھی کہ عادل دفتر سے آ گیا اور وہی ہوا آتے ہی اس نے حفصہ کا چہرہ پڑھ لیا۔بغیر کسی تاثر کے حفصہ نے اس کو چائے پانی کا پوچھا۔

''شاید دوپہر کو گھر نہ آنے پر خفگی کا اظہار کر رہی ہے۔'' یہ سوچ کر عادل نے حفصہ کی جھولتی لٹ کو اپنی طرف ہلکے سے کھینچا۔''خادم ملکہ عالیہ کی توجہ کا منتظر ہے۔'' اس نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''عادل پلیز! مجھے نہ تنگ کریں میں مصروف ہوں۔'' اس نے کپڑوں کی الماری میں خوامخواہ سر گھسا لیا۔

''اچھا! تو کوئی اور مسئلہ ہے۔'' عادل نے اندازہ لگانے میں دیر نہ کی۔

عادل کے پاس بھی ایک کارگر نسخہ تھا، اس کے موڈ کو درست کرنے کا۔

''اچھا، تم تو مصروف ہو۔میں پھر اعجاز کی طرف جا کر شطرنج کی ایک بازی لگا آتا ہوں۔''

اعجاز کی طرف جانے کا مطلب تھا کہ عادل رات کے دو بجے سے پہلے گھر نہیں آئے گا حفصہ مزید تنہا اس پریشانی سے نبرد آزما نہیں ہونا چاہتی تھی۔

''جب عادل سے کہنا ہی پڑے گا۔ تو پھر ابھی کیوں نہیں۔ خوامخواہ میں بھی جلتی کڑھتی رہوں گی اسکے گھر سے باہر رہنے پر۔ ایک ہی پریشانی کیا کم ہے۔'' یہ سوچ کر حفصہ نے کمرے سے باہر نکلتے عادل کا ہاتھ پکڑ لیا۔''عادل! پلیز نہ جائیں میں بہت پریشان ہوں۔'' اس کی آواز میں نمی شامل تھی۔

''چلو تم کہتی ہو تو نہیں جاتا۔'' احسان جتانے کا انداز خاصا واضح تھا۔''ہاں، کیا پریشانی ہے؟'' اس نے حفصہ کو صوفے پر بٹھایا اور خود اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

حفصہ وہ الفاظ تلاش کرنے لگی جو بات کو آسانی سے ادا کرنے میں مدد دے سکیں۔ وہ کبھی ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگتی، کبھی دوپٹے کا کونہ انگلی میں لپیٹنے لگتی۔ بہت ہمت کر کے آخر اس نے کہا ''عادل! طیبہ خالہ نے اچھا نہیں کیا، بلکہ بہت برا کیا۔''

عادل کا دل چاہا کہ وہ زور سے خوشی کا ایک نعرہ لگائے اور اس سے پوچھے''واقعی! کیا طیبہ خالہ بھی کچھ اچھا نہیں کر سکتیں۔ بلکہ بہت برا ان سے بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ حیران بلکہ پریشان تھا۔ حفصہ کی سنجیدہ شکل دیکھ کر اس نے مذاق اور خوشی کا اظہار ملتوی کر دیا۔ وہ حفصہ کے منہ سے یہ سننے کی کبھی توقع نہ کر سکتا تھا۔ دن میں بیسیوں مرتبہ روزانہ اس کو طیبہ خالہ کے قصیدے سننے پڑتے تھے اور وہ ہمیشہ سوچتا کہ انسان کو اپنے محبوب میں خامی نظر نہیں آتی اور نظر آ جائے تو بری نہیں لگتی۔

مگر آج تو انہونی ہے اس نے حفصہ کو غور سے دیکھا''اچھا، کیا کیا انہوں نے؟'' وہ بھی تکلفاً سنجیدہ ہو گیا۔

اور حفصہ آہستہ آہستہ سب اس کے گوش گزار کرنے لگی جو اس نے سامیہ کی ای میل میں پڑھا اور پھر skype پہ بات کر کے سنا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو عادل نے حفصہ کے سر پہ ہلکی دھپ لگاتے ہوئے کہا''حفصہ رانی! تو کب بنے گی سیانی۔ طیبہ خالہ کی عظمت کا تو میں بھی اب قائل ہو گیا ہوں۔ ان کا یہ اقدام تو ان کی ساری عمر کی نیکیوں پہ بھاری ہے۔''

''کیا مطلب؟'' حفصہ کے لئے یہ ردعمل بالکل انوکھا تھا۔ وہ اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ ہمیشہ طیبہ خالہ کی بات سن کر مذاق بنا لیتا تھا۔ میز پہ رکھے پانی کے جگ میں سے عادل نے گلاس میں پانی انڈیلا اور حفصہ کو دیا۔''لو تھوڑا سا پانی پیؤ۔ میں سمجھا تا ہوں تمہیں۔''

حفصہ نے پانی پی کر گلاس گود میں رکھ لیا اور اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''تم نے بتایا تھا کہ فاطمہ جب بیاہی گئی تو وہ اپنی بہن کے فوت ہونے کے بعد اسی گھر میں گئی اور ایک چھوٹی سی بچی بھی اس کی پہلے دن سے ذمہ داری تھی۔''

حفصہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پھر ان گزشتہ تین سالوں میں جو حالات پیش آئے اس سے تم مجھے مطلع کرتی رہی ہو۔ فاطمہ کی ساس فوت ہو گئیں۔ اس کے شوہر کی ڈیوٹی شفٹوں میں ہوتی ہے کبھی ساری رات تو کبھی سارا دن۔ اس کی کوئی روٹین نہیں۔''

''ہاں یہ میں نے بتایا تھا۔'' حفصہ نے جواب دیا۔

ابھی گزشتہ مہینے تم نے بتایا تھا کہ فاطمہ کے جڑواں بیٹے ہوئے ہیں اور پچھلے ہفتے تم نے اطلاع دی تھی کہ فاطمہ کے سسر پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور ان کو چوبیس گھنٹے کسی کی ضرورت رہتی ہے۔ اور وہ بہت پریشان کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے تین بچے، تنہا فاطمہ یہ سب کیسے کر سکتی ہے؟ اس شہر میں کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہیں ہے اور ویسے بھی آجکل کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ فاطمہ کے لئے تو کوئی ماسی مل سکتی ہے مگر ایک معذور اور محتاج مرد کا ساتھ ایک بیوی ہی نباہ سکتی ہے۔ حفصہ بیگم! شادی صرف عیش وعشرت یا اس طرح کی دیگر ضروریات کو پورا کرنے کا نام نہیں۔'' عادل حفصہ کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے کے تاثرات رنگ بدل رہے ہیں وہ پہلو بدل کر تیز آواز میں بولا''ایک غیر محرم مرد کی جسمانی معذوری میں نرسوں کا ہر

وقت خدمت کرنا، ثواب کا کام ہے اور دنیا کی نظر میں ایک محتاج ومعذور انسان کی خدمت کرنے کیلئے نکاح کرنا گناہ ہے۔واہ! یہ دنیا والوں کے نرالے دستور۔'' عادل نے افسوس سے گھٹنے پہ ہاتھ مارا۔

حفصہ کو ایک دم محسوس ہوا کہ وہ ایک اندھیرے کمرے میں کھڑی تھی اور عادل نے بلب کا بٹن آن کر کے کمرہ روشن کر دیا ہے۔اب اس میں پڑی ہر چیز واضح اور مناسب جگہ پہ رکھی نظر آ رہی ہے۔اس نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبا سانس لیا۔ سینے پہ ہاتھ باندھتے ہوئے بولی۔''ہائے! عادل مجھے سکون مل گیا ہے۔آپ بہت اچھے ہیں۔''

''طیبہ خالہ سے بھی زیادہ اچھا ہوں نا؟'' عادل کے لہجے میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''بڑی خوش فہمی ہے آپ کو۔'' حفصہ نے گلاس میں بچے ہوئے پانی کے قطرے عادل کے منہ پر پھینک دیئے۔

دونوں کی ہنسی نے کمرے اور دل میں پھیلی اداسی کو دور کر دیا۔

☆☆☆

مہمانِ خصوصی

ہفتہ تقریبات نہ ہوتو تعلیمی زندگی کو چار چاند کون لگائے۔ وہ طلباء بہت کم ہوتے ہیں جنہیں صرف کتابوں سے عشق ہو اور دنیا کی رنگینیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں پھر عمر کا دور ایسا ہوتا ہے کہ ہنسنے بولنے کھانے پینے پہننے کھیلنے، سننے اور سنانے کے دن ہوتے ہیں انسان کتابوں اور اساتذہ کی مدد سے سے خود کو دریافت کرتا چلا جاتا ہے۔

ان رنگینیوں کا سہرا طلباء یونین کے سر ہی باندھنا چاہیے۔ الیکشن سے پہلے، انتخابی مہم ،پوسٹر، پارٹیاں، تعلقات اور پھر ذمہ داریوں کو نئے اسلوب اور سلیقے سے نبھانے کی روایت۔اس زمانے میں دل کی سلیٹ خالی ہوتی ہے یعنی اس پر حرص لالچ کے سائے نہیں ہوتے۔ پھر تقریری مقابلے جن میں نہ صرف مقرر کے جوہر کھلتے ہیں بلکہ تقریر لکھنے والے کا علم بھی تقسیم ہوتا ہے۔گرمی اور گرم جوشی دونوں ساتھ ساتھ عروج پر ہوتی ہیں۔ دلائل کے ساتھ لہجے کی کاٹ، زبان کی تیزی، چوندے چوندے شعروں کا درمیان میں فٹ ہونا سماں باندھ دیتا ہے۔ وہ تالیاں بجتی ہیں کہ خدا کی پناہ، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

یونین کے ارکان یونیفارم پر بیج لگائے سر پر ذمہ داری کا تاج رکھے اپنی انا کے بالا خانے میں گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔اتھارٹی چاہے کیسی بھی ہو اور کتنی بھی ایک اور ہی دنیا کی سیر کرا دیتی ہے۔

سچ ہے کہ اقتدار کا نشہ ایسا ہی ہوتا ہے پھر بے چارے حکمرانوں کو کیوں لتاڑا جاتا ہے۔ ان کا بھی ایوان اقتدار سے جانے کو جی نہیں چاہتا لیکن بندے خود سمجھدار نہ ہوں تو پھر عوام آ کر کٹہرے کا راستہ دکھا دیتے ہیں۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی یہ بھی آج کل ہوا کے جھونکے کی طرح ہے، اپنی مرضی سے راستہ بناتی ہے۔فنکشن میں سب سے اہم ''مہمان خصوصی'' ہوتا ہے یقیناً یہ روایت بھی انگریز نے ورثے میں چھوڑی ہوگی۔ جیسے ڈگری لیتے وقت ہم گاؤن اور ہڈ پہنتے ہیں۔ ایسا ہی ایک فنکشن تھا، ہیڈ گرل اور ٹیچرز مہمان خصوصی کے انتخاب کی میٹنگ میں مصروف تھے۔ مائی بکھی چائے کی پیالی ہر ٹیچر کو دے رہی تھی ساتھ ایک سموسہ بھی۔ایک آواز

''کمشنر کی بیگم کو بلالیں۔ وہ ضلع کا حاکم ہی تو ہوتا ہے۔''

''ارے وہ تو ختم ہو گئے اب تو ناظم اعلیٰ ہیں۔''

''نام ہی تو بدلا ہے کام تو نہیں بدلا۔''

''بڑا فرق ہے جناب، کمشنر تو آئی سی ایس ہوتے

ہیں۔تہذیب ،علم ،رکھ رکھاؤ۔ ناظم اعلیٰ دیسی بندہ۔جس کو مرضی ہے کرسی پر بٹھادو۔''

''اچھا آج کل بار کی صدر خاتون ہے وہ کیسی رہے گی؟''

''نہ بابا! وہ اتنی لمبی تقریر کرتی ہے مائیک کی جان نہیں چھوڑتی۔''

''لیڈیز کلب پہ نظر ڈالو۔''

''وہاں سے ایک کو بلایا تو دوسری خفا ہو جائیگی۔''

''اچھا یہ بتاؤ اس میں کیا خوبیاں ہوں۔''

''گریس فل ہو، اچھا بولے مگر کم اور علم بھی ہو یہ نہ ہو فیشن کا اشتہار ہو۔ لگے سیدھی ٹی ویسٹیشن سے آئی ہے۔ہلکی سی جیولری، پروقار لباس اور شاہانہ چال ہو۔''

''تم لڑکی تلاش کر رہی ہو یا مہمان خصوصی۔''

''اچھا الھُدیٰ یا النور سے کسی کو بلالو۔''

''نہ بابا وہ حدیثیں سنا سنا کر ہم سب کو پکا گنہگار ثابت کر کے سٹیج سے اتریں گی۔''

''اچھا ہے نا ہمارا عمل ہی بدل جائے۔خوف خدا دلوں میں پیدا ہو۔''

''بھئی کوئی مہمان خصوصی آخر کیوں بنے۔ اسے کیا فائدہ ہے۔''

''واہ! اسے اتنا پروٹوکول ملتا ہے۔''

''تصویریں بنتی ہیں اخبار اور اب تو ٹی وی میں خبر لگتی ہے مفت کی شہرت کسے بری لگتی ہے چاہے وقتی ہو۔''

''کسی کرکٹر یا فلمسٹار کو بلالو۔''

''توبہ کرو، طالبات کے والدین شور مچادینگے۔''

سب سے آخر میں انجم بولی کہ ''یہ مسئلہ تو حل ہوتا نظر نہیں آتا۔تم لوگوں نے دو پیریڈ فضول میں ضائع کر دیئے ہم نے کونسا کسی سے چندہ مانگنا ہے۔ میرا خیال ہے اماں سکینہ کو اس دفعہ مہمان خصوصی بناتے ہیں اس نے یہاں بیس سال سروس کی ہے۔ بلکہ سب کی خدمت کی ہے۔اسکا حق بنتا ہے ایک دن اس کرسی پر بیٹھ جائیگی تو کیا ہو جائیگا۔''

''ویری گڈ آئیڈیا، بٹ اماں سکینہ تقریر کریں گی؟''

''کیوں نہیں، وہ اپنے دل کی بات کرینگی۔''

سب ٹیچرز نے اسے کہا تو وہ مان گئی۔

تقریب کے اختتام پر سٹیج سیکرٹری نے برا سا منہ بنا کر اماں سکینہ کی طرف دیکھا اور کہا اب میں آج کی مہمان خصوصی کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ سٹیج پر آ کر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

وہ تشریف لائیں اور بولیں۔

میری بہنو اور بیٹیو! یہ پانچ دن سے ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس نے ہمیں تھکا دیا ہے۔ پتہ نہیں آخرت میں اس کا کوئی اجر ملے گا یا نہیں لیکن دنیا میں تو ضرور ملے گا کہ کل چھٹی ہو جائیگی، آپ سب مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی اور لائق فائق ہیں میں کیا بتاؤں سوائے اس کے پیٹ بڑا ظالم ہے، مَیں بڑی ظالم ہے اور مرد بڑا ظالم ہے، ہم عورتیں ان تینوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، پیٹ کیلئے روٹی، مزدوری کرو، میں کیلئے

یہ کرسی.....جو مرضی کرو ایک بار مل جائے سہی، مرد کی خدمت خاموشی اور چاکری۔ زندگی اسی چکر میں گزر گئی، تسی جو مرضی کرو، جتنا مرضی پڑھ لو، جو مرضی بن جاؤ، ایہہ چکر تاں مرن تک نال ای رہنا اے، ہن تسی سمجھدا ہو پاویں خوشی نال کرو پاویں رو کے کرو چھٹکارا نہیں ہے، سیانے کہتے ہیں، سوہنے رب نے ایہہ آزمائش واسطے ہی پیدا کیتا، سن لیا، رب راکھا۔

تالیاں.....تالیاں.....پھر تالیاں

☆☆☆

شمیم فاطمہ

کہ.....ساون آیا

کبھی انسان تبدیلی لاتا ہے کبھی قدرت تبدیلی لے کر آتی ہے۔ کچھ تبدیلیوں پر انسان کا بس چلتا ہے اور کچھ پر نہ بس چلتا ہے نہ رکشہ، نہ ٹیکسی.....

تبدیلی بھلا کسے اچھی نہیں لگتی؟ تبدیلی کا کون منتظر نہیں رہتا! (بشرطیکہ تبدیلی خوشگوار ہو) روز روز دال روٹی کھانے والا سوچتا ہے کہ ''اب اس مینو میں کچھ تبدیلی ہو جانی چاہیے!'' چڑچڑے خاوند کی بدمزاجی سے دلبراشتہ بیوی بھی دل سے کسی ''تبدیلی'' کی خواہاں ہوتی ہے (خواہ تبدیلی ٹرانسفر کی صورت میں ہو یا پردیس چلے جانے کی صورت میں..... کچھ دن سکون سے تو گزریں گے) سخت گیر استاد کی تبدیلی کی دعا معصوم طلباء کی زبان پر کب نہیں ہوتی؟ پہلی سے سر ٹکرانے (اور پاش پاش ہو جانے) والے کو دوسری کا خیال کب نہیں آتا! ہر کوئی دل سے تبدیلی کا آرزو مند ہوتا ہے۔ انسان اندر سے تبدیل ہونا چاہے یا نہ چاہے باہر سے ضرور تبدیل ہو جاتا ہے۔ فیشن انڈسٹری، سلمنگ سینٹر اور پارلر وغیرہ کے قیام کا مقصد ہی آپ کی زندگی میں کچھ چینج لانا ہے۔ چنانچہ ہر ماہ فیشن بدلتا ہے، فیشن کے ساتھ ساتھ آپ بھی بدل جاتے ہیں۔ لباس فاخرہ پہن کر آپ کا مزاج بھی فاخرانہ ہو جاتا ہے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آپ چیلنج کرتے ہیں کہ ہم سا ہو تو سامنے آئے۔

بیوٹیشن کے ہار سنگھار اور آپ کے ناز و انداز کے بعد تو یہ تبدیلی اتنی نمایاں ہو جاتی ہے کہ کسی اندھے کو بھی نظر آ جاتی ہے۔ آپ کے وہ احباب و اقرباء جن کی نظر کمزور ہو چکی ہو وہ آپ کو آوازیں دیکر یا ہاتھوں کے اشارے سے قریب بلاتے ہیں اور آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر کہتے ہیں ''تو قریب آ تجھے دیکھ لوں.....تو وہی ہے یا کوئی اور ہے!''

بسا اوقات تو آپ کو خود یقین نہیں آتا کہ یہ حسین دلکش سراپا خود آپ کا ہی ہے (یا آپ کے اندر کوئی ماڈل حلول کر گئی ہے!) لیکن جب آپ اس آرائش و زیبائش کی ''فیس'' اپنے ہاتھوں سے ادا کرتی ہیں تو یقین کرنا ہی پڑتا ہے کہ یہ آپ ہی ہیں۔

تبدیلی کے خواہش مند کبھی گھر تبدیل کرتے ہیں، کبھی علاقہ تبدیل کرتے ہیں، کبھی فرنیچر تبدیل کرتے ہیں، کبھی کار تبدیل کرتے ہیں، کبھی معیار تبدیل کرتے ہیں، کبھی سراپا تبدیل کرتے ہیں، کبھی آئین تبدیل کرتے ہیں، کبھی نظام، کبھی حکمران تبدیل کرتے ہیں، کبھی پارٹی.....تبدیلی کبھی چپکے چپکے کی جاتی ہے کبھی علی الاعلان.....کبھی دھیرے دھیرے آتی ہے۔ کبھی دفعتاً آ جاتی ہے۔ کبھی انسان تبدیلی لاتا ہے کبھی قدرت تبدیلی لے کر آتی ہے۔ کچھ تبدیلیوں پر

انسان کا بس چلتا ہے اور کچھ پر نہ بس چلتا ہے نہ رکشہ، نہ ٹیکسی.....کچھ تبدیلی غیر متوقع اور اچانک ہوتی ہے۔ کچھ تبدیلی متوقع اور یقینی ہوتی ہے۔

جب ساون رت کی پون چلتی ہے تو موسم کی تبدیلی کا اعلان خود ہی ہوجاتا ہے (یہ اور بات ہے کہ متوقع تبدیلی کے لئے ہم کوئی منصوبہ سازی نہیں کرتے البتہ غیر متوقع تبدیلی کے حوالے سے خوب خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں!)

موسم کی یہ تبدیلی ہر انسان پر مختلف انداز سے اثر انداز ہوتی ہے۔ کسان خوش ہوتا ہے کہ اب بارشیں ہوئیں تو اس کی کھیتی لہلہائے گی۔ ٹیکنیشنز خوش ہوتے ہیں گھروں میں پانی بھرے گا تو برقی آلات ناکارہ ہوں گے، جن کی درستگی کے لئے لوگ ہمارے پاس دوڑے چلے آئیں گے اور ہم ان سے منہ مانگی اجرت وصول کریں گے جسے وہ بادلِ نخواستہ دینے پر مجبور ہوجائیں گے۔ کباڑی والے خوش ہوں گے بارش سے لوگوں کا ساز وسامان بھیگ بھیگ کر سستا یا اس ہوجائے گا جسے ہم کوڑیوں کے مول خرید لیں گے۔ رکشہ ٹیکسی والے خوش ہوتے ہیں کہ اب وہ دگنا کرایہ وصول کریں گے اور ان کی چاندی ہوجائے گی۔ گوالے خوش ہوں گے کہ اب دودھ میں نلکے سے پانی نہیں ملانا پڑے گا (دودھ کی بالٹی آسمان تلے رکھ دیں گے اور پانی براہ راست!) سڑکوں کی مرمت کرنے والے خوش ہوں گے کہ اب سڑکوں کی مرمت کا ٹھیکہ ملے گا۔ اونٹ بان اور گھوڑے بان خوش ہوں گے کہ اب لوگ ساحل سمندر کا رخ کریں گے اور ہمیں بھی دال روٹی کا آسرا ہوجائے گا۔ جو لوگ آپس میں بات کرنے کے لئے کوئی بہانہ اور ملاقات کیلئے کسی تقریب کا انتظار کرتے ہیں وہ خوش ہوجائیں گے کہ اس برسات کے بہانے ملاقات کا موقع مل جائیگا اور بات کا بھی (کرلیں گے چار باتیں اسی بات کے بہانے) پک اینڈ ڈراپ والے خوش ہوجائیں گے کہ اب لوگ پکنک پہ جانے کیلئے ہم سے رجوع کریں گے۔ نوجوان خوش ہوجائیں گے اب آؤٹنگ کا موقع ملے گا۔ بچے خوش ہوکر ابا کے سر ہوجائیں گے کہ ''بس پاپا! ایک پکنک ہو ہی جائے'' بچوں کی اماں خوش ہوجائیں گی کہ روز روز کی چولہا چکی سے ایک روز فرصت تو ملے گی نیز مدتوں سے جو گلے شکوے دلِ پُرخوں میں پل رہے ہیں اس پکنک کے بہانے ہی لبوں پر آجائیں گے، کچھ تو دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ موسمیات کے ماہرین خوش ہوجائیں گے کہ اب ہر چینل سے ان کا انٹرویو نشر کیا جائیگا جہاں انہیں اپنی ''موسمدانی'' کے اظہار کا بھرپور موقع میسر آئے گا۔ فلمساز خوش ہوں گے کہ ''بارش'' کے سین کی فلمبندی کے لئے مصنوعی سیٹ لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ فلمی شعراء خوش ہوں گے کہ انہیں ایسے نغمے تخلیق کرنے کا موقع ملے گا کہ ایک دنیا رومان پروری کی جانب مائل ہوجائے گی۔ موسیقار ایسی دھنیں ترتیب دیں گے کہ لہریں بھی مستانی ہوجائیں گی۔ پردیسی بابوؤں کی بیگمات رنجیدہ ہوہوکر ایس ایم ایس کریں گی کہ ''تو چھٹی لے کے آجا بالما!'' (بالما وہاں گلچھرّے اڑا رہے ہوں گے سو چھٹی منظور نہ ہونے کا دکھڑا روئیں گے!) کچھ

رومان پسند بیگمات جونشیبی علاقوں میں رہائش پذیر ہوں گی بار بار یہ پیغام بھجوائیں گی کہ'' اب کے ساون تو سجن گھر آجا!'' (سجن کو معلوم ہوتا ہے اس پکار کے پیچھے بھولی بسری محبت نہیں بلکہ وہ متوقع مسائل ہیں جو بارش کے بعد بیگم کو درپیش ہیں!)

ساون رت کی پون چلے گی تو دل گھبرائے گا۔آلو کے پراٹھے، بیسن کی روٹی اور پکوان کی خواہش تیل کی مہنگائی میں دب جائیگی۔شجر کاری کی ناکام مہم کے باعث نہ پیڑ ہوں گے، نہ جھولے ڈالے جائیں گے۔کالی گھٹاؤں کو دیکھ کر دل کے تار بجنے سے پہلے ہی یوں ٹوٹ جائیں گے جیسے پانی کی بوند پڑتے ہی بجلی کے تار ٹوٹ جاتے ہیں۔محبتوں کی پیغام رسانی موبائل کے چارج نہ ہونے کے باعث التوا میں پڑ جائیگی۔ چھت پر برکھا برسے گی اور آنکھیں تیرے سپنے بھی نہ دیکھ سکیں گی کہ آنکھوں کے آگے کیسے کیسے دلخراش مناظر ہوں گے۔بجلی کے تعطل سے ہر طرف ایک گھور اندھرا ہوگا۔گلیاں ندیاں بن جائیں گی۔سڑکیں تالاب بن جائیں گی۔ایک قدم سڑک پر رکھنے والا دوسرا قدم تلاش ہی کرتا رہ جائیگا کہ.....کس گڑھے میں پڑ گیا۔ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا کارمحال بن جائے گا۔چھیپا اور ایدھی کی ایمولینس تیار کھڑی ہوں گی کب کوئی حادثہ ہوجائے اور ہماری ضرورت آن پڑے۔ موٹر سائیکل والے پھسل پھسل کر گریں گے اور گر گر کر پڑے رہیں گے راہوں میں (اور کراہتے ہوئے کہیں گے کہ'' ہڈی توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں!'')

تاحدِ نظر پانی ہی پانی ہوگا۔(صورتحال کچھ یوں ہوگی کہ اب تو ہر شے کا نشاں ہے پانی!) گھر میں پانی، رہگزر میں پانی، کوچہ و بازار میں پانی، صحن اور چھت پہ پانی، آنکھ میں پانی.....! اور جب آنکھ میں پانی بھر جائے تو منظر دھندلا جاتے ہیں۔کیسی گھنگور گھٹا.....کہاں مور مچائے شور.....کہاں کسی کی یاد! کہاں ابر کرم کی اٹھکھیلیاں! کہاں جھولے، کہاں کا ساون، کہاں کے ملہار!

ناپسندیدہ صورتحال سے پناہ کی ایک ہی صورت باقی رہتی ہے کہ اماں کو فوری پیغام بھیجا جائے کہ''اماں! مورے باوا کو بھیجوری کہ ساون آیا!''

☆☆☆

سمیہ رمضان احمد
ترجمہ: میمونہ حمزہ

مجاہد بیویاں

ہم یہاں پانچ محترم بیویوں کا تذکرہ اختصار کے ساتھ پیش کررہے ہیں؛ یہ اخوان المسلمون کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے والے پہلے پانچ رہنماؤں؛ حسن البنا، حسن الہضیبی، عمر تلمسانی، محمد حامد أبونصر اور مصطفیٰ مشہور کی ازواج ہیں، یہ سب خانگی زندگی اور حسن معاشرت کا بہترین نمونہ ہیں، انکی زندگیاں صبر کی مثال ہیں، وہ دعوت اسلامی کی خدمت اور اس پر خار راستے پر ہر مشقت برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی تھیں۔

ا۔ سیدہ لطیفہ حسین الصوری (زوجہ الشیخ حسن البنا)

☆ فقہ اور قرآن کریم کی تعلیم انہوں نے بچپن میں والد کے ہاں حاصل کی تھی۔

☆ شادی کے بعد انہوں نے اس دعوت کی اہمیت بھی جان لی تھی وہ اپنے شوہر کی بہت قدر دان تھیں، وہ حسن البنا کے دعوتی افکار سے پوری طرح متفق تھیں، وہ انکا حد درجہ احترام کرتیں، یہاں تک کہ انہیں ''استاذ'' کہہ کر مخاطب کرتیں۔

☆ وہ تقوی میں حسن البنا سے کم نہ تھیں، بلکہ وہ دونوں ہی مودت اور رحمت کی مثال تھے۔

☆ جب اخوان المسلمون کے پہلے مرکز کا افتتاح قاہرہ میں ہوا تو انہوں نے اسکے لئے اپنی شادی کے وقت کے پردے اور گھر کے قالین بھجوا دیئے، بلکہ گھر میں جو کچھ بھی قیمتی نظر آیا سب مرکز کو ھدیہ کردیا، اور یوں انہوں نے ثابت کردیا کہ انہیں اس دعوت سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبت ہے۔

☆ وہ اپنی پڑوسنوں کے ساتھ مل کر مرکز میں آنے والے مہمانوں کی ضیافت اور کھانے پکانے میں مصروف رہتیں، انکے ہاں سبزیوں، گوشت، مرغی وغیرہ کے تھیلے بھر کر آتے، اور وہ پکا کر پیک کرکے گرما گرم مرکز میں بھجوادیتیں۔

☆ اگرچہ انہیں دل کا عارضہ تھا مگر وہ اپنے شوہر اور اولاد کو راحت پہنچانے کیلئے کام میں جتی رہتیں۔

☆ انکے ہاں چھ بیٹیاں اور دو بیٹے پیدا ہوئے، اور ایک بیٹا اور بیٹی انتقال کرگئے۔

☆ آخری حمل کے دوران انکی زندگی کو خطرہ لاحق تھا، لہٰذا ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ وہ اسقاط حمل کردیں گے، اس کیلئے ۱۳ فروری کا دن طے پا گیا۔ اور یہ اللہ کی تقدیر تھی کہ ۱۲ فروری کو حسن البنا شہید کردیئے گئے، اس باہمت خاتون نے اپنی اولاد کو اس مشکل گھڑی میں تنہا چھوڑنے سے انکار کردیا

،جبکہ حالت یہ تھی کہ یہاں شاہراہیں اور انکا گھر بھی جیل بن چکا تھا۔ ہر جانب فوج کھڑی تھی، اور کسی بھی شخص کا اندر آنا باہر جانا ممنوع تھا۔ بعد میں انکے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی۔ جسکا نام انہوں نے ''استشہاد'' رکھا، تاکہ حسن البنا کی شہادت انکے اور انکی زوجہ کیلئے بہترین خوشخبری بنے۔

☆جس روز حسن البنا کے والد شہید ہوئے دفن کے وقت انہوں نے قبر سے تکبیر کی آوازیں سنیں، سیدہ لطیفہ اور انکی بیٹیاں قبر میں اتریں، تاکہ وہ سب حسن البنا کو دیکھیں، ایسا لگتا تھا جیسے انہیں ابھی ابھی دفن کیا گیا ہو، انکی زوجہ بولیں: آپ بالکل ایسے ہی تھے استاد۔۔سو رہے ہیں اور خوش ہیں''

انکی بیٹی سناء حسن البنا کہتی ہے کہ ''جس روز ہم نے اپنی والدہ کو دفن کیا اس روز بھی ہم نے اپنے باپ کا چہرہ دیکھا، جو اسی طرح جگمگا رہا تھا، صرف ٹھوڑی کے بال غائب تھے، اس نے بتایا کہ والدہ کے دفن کے موقع پر ریاستی امن کے ادارے کے اہلکار بھی ہمارے ہمراہ تھے اور یہ منظر انہوں نے بھی دیکھا۔''

☆انکی زوجہ انکی مصروفیت کے باوجود انکے گھر واپس لوٹنے کا بڑی بے چینی کا انتظار کرتی تھیں تاکہ وہ شوہر اور بچوں کے ساتھ مل کر کھانا کھائیں، اور تمام عمر یہی انداز رہا، اِلّا نکہ وہ سفر میں ہوں اور وہ دوسروں کے سامنے بھی ان سے احترام سے پیش آتی تھیں۔

(یہ معلومات حسن البنا کی صاحبزادی سناء حسن نے فراہم کیں)

۲۔سیدہ نعیمہ خطاب (دوسرے مرشد حسن الہضیبی کی اہلیہ)

☆ آپ پر اللہ رحمت کی بارش کرے، اخوان کی فکر آپ میں رچی بسی ہوئی تھی، آپ احساس کی گہرائی کے ساتھ انکا ساتھ دیتیں، خواہ وہ ۱۹۴۸ء کے مصائب ہوں یا جماعت کے قیام کے مسائل، انکے بیگ میں ہمیشہ اخوان کے کتابچے ہوتے، جو وہ تمام ذرائع اختیار کر کے لوگوں میں پھیلاتی رہتیں، وہ کہا کرتی تھیں: ''اخوان کو پہچانو، یہ امت کے نوجوان ہیں۔''

☆مرشد کا منصب قبول کرنے سے پہلے حسن الہضیبی نے اہلیہ سے مشورہ کیا، کیا وہ یہ منصب قبول کرلیں؟ تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا انہوں نے کہا: ہمیں قید اور بھوک کا سامنا ہوسکتا ہے وہ عزم سے بولیں: یہ اللہ کی راہ میں محبت اور عزت افزائی ہے۔

☆اور پھر ۱۹۵۴ء کا سال بھی آیا جس میں حسن الہضیبی کو موت کی سزا سنائی گئی، انہوں نے اسے اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کیا، وہ اپنی اولاد کی بھی پوری نگرانی کرتیں، اور جب غزہ سے انکے بیٹے ''مامون'' نے ان سے بات کی کہ وہ چیف جسٹس سے اس سزا کیخلاف اپیل کرے گا، انہوں نے اس سے پوچھا: مامون ذرا بتاؤ سب سے اچھا جہاد کیا ہے؟ وہ بولا: ''ظالم حاکم کے سامنے کلمہء حق کہنا''، تو وہ زور دے کر بولیں: تو پھر تمہارا باپ حق پر ہے اور یوں بات ختم ہوگئی۔

☆انہوں نے اس سے بھی قطعی طور پر انکار کر دیا کہ انکے شوہر کی سزا میں تخفیف کیلئے انکی چھوٹی بیٹی کی جانب سے ''جمال عبدالناصر'' کو اپیل کی جائے، کیونکہ وہ انکی عزت نفس کو مجروح نہ کرنا چاہتی تھیں۔

☆لیکن یہ اللہ کی قدرت تھی کہ کسی اپیل کے بغیر ہی سزائے موت کا فیصلہ قید با مشقت میں تبدیل کر دیا گیا، وہ باقاعدگی سے انکی ملاقات کو جاتیں، انکے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی، تاکہ انہیں انکی مشکلات کا اندازہ نہ ہو۔

☆۱۹۵۴ء کی آزمائش میں وہ گرفتار شدگان کے اہل خانہ کی معاونت میں پیش پیش رہیں۔ جب حالات اتنے سنگین تھے کہ لوگوں کے ماہانہ مشاہرے تک بند کر دیئے گئے تھے اور انکے گھر والوں تک بھی کچھ پہنچنے نہ دیا جاتا، اس دوران وہ ذاتی طور پر مقدمے کی پیروی بھی کر رہی تھیں۔

☆۱۹۶۵ء میں قید و بند کا سلسلہ ختم ہو گیا، اسوقت انکی عمر ستر برس ہو چکی تھی۔ وہ ذیابیطس کی مریضہ تھیں اور انکے سر پر ''قید میں پڑے اخوان کی مدد'' کا الزام تھا، جب وہ تحقیقات کیلئے پیش ہوتیں وہ حیرت سے انکی جانب دیکھتیں، اور ایک بات دہراتیں: ''احکم الحاکمین کہاں ہے؟''

☆ وہ تحقیقی افسران کو بھی دعوت دیتی رہتیں، اور با مقصد اور مؤثر کتابوں کی جانب توجہ دلاتی رہتیں۔

☆وہ علم النفس اور تربیت کے موضوع پر خصوصی مطالعہ کرتیں، انکے شوہر بھی انکے ذوق مطالعہ سے آگاہ تھے، اور ان موضوعات پر کتب لے کر آتے، بلکہ شادی کے بعد انہوں نے انہیں جو پہلی کتاب تحفہ دی وہ علم النفس ہی کے موضوع پر تھی، شادی کے بعد ہی انہیں معلوم ہوا کہ انکے شوہر فرانسیسی زبان (فرنچ) کے ماہر ہیں، بلکہ ان سے بھی اسی زبان میں گفتگو کر لیتے ہیں۔ تو انہوں نے ایک استانی کا بندوبست کیا اور اس سے فرنچ سیکھ لی، تاکہ وہ انکا پورا ساتھ دے سکیں۔ اور انکی بیوی اور دوست اور حبیبہ بن جائیں۔

☆انکے شوہر بھی انکا احترام کرتے، اور انکی قدر افزائی کرتے، اور کئی معاملات میں فیصلہ کرنے سے پہلے بڑے اعتماد سے اخوانیوں سے کہہ دیتے، اس معاملے میں مجھے ذرا مہلت دو، تاکہ میں اپنی اہلیہ سے مشورہ کر لوں، یا یہ کہ میں اس معاملہ میں اہلیہ کی رضامندی کے بغیر ہرگز فیصلہ نہ کروں گا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انکا کتنا احترام کرتے تھے۔ اور انکے دل میں انکی کتنی قدر تھی یہ الگ بات کہ اہلیہ کی رائے بھی ہمیشہ انکی رغبت اور خواہش ہی کے موافق ہوتی۔

☆۱۹۵۴ء کے پرآشوب دور میں جب سب قیدیوں کے مشاہرے بند کر دئے گئے، انہوں نے سب اخوات کو جمع کیا: ''اب لازم ہے کہ ہم سب کمائی کریں، جس سے جس قدر بن پڑے وہ اسی قدر محنت کرے، اللہ کی قسم، اگر ہمیں ''فول'' (لوبیا کی ایک قسم) کا دیگچہ پکا کر اسے بیچنے کیلئے گھروں کے دروازے بھی کھٹکھٹانے پڑے تو ہم یہ بھی کریں گی،'' اور واقعی تمام خواتین مختلف کاموں میں جت گئیں، کسی نے کپڑے سلائی کرنے شروع کر دیے، کسی نے

کڑھائی کرنے، اور کسی نے کپڑے بیچنے شروع کردیے، ان تمام کاموں کی مناسب اجرت لی جاتی تاکہ کام چلتا رہے اور انکے گھر میں ان سب اشیاء کے ڈھیر لگ گئے، کہیں کپڑے پڑے ہیں اور کہیں تول کے باٹ، اور کہیں پیمانے ،لیکن وہ چین سے نہ بیٹھیں اور قیدی بھائیوں کے گھرانوں کی کفالت میں مدد کرتی رہیں۔

☆ ان سے تحقیق کے دوران پولیس نے ان سے پوچھا: آپ کیا پڑھتی ہیں؟ انہوں نے کہا: مجھے یوسفؑ یاد آتے ہیں، جب وہ قید خانے میں تھے، تو ان کے پاس فرصت تھی، تو میں نے انہیں کا تذکرہ ایک بہت پراثر تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں پڑھنا شروع کردیا، اور اس کتاب کا کیا حسن بیان اور جادوئی اثر ہے کہ ایک جز پڑھ لو تو اسوقت تک چین نہیں آتا جب تک مکمل نہ پڑھ لو، اور یہ سب انہوں نے اس امید پر کہا کہ پولیس کا یہ افسر بھی اسے پڑھنے کے بارے میں سوچے، اور وہ خود بتایا کرتی تھیں کہ اسوقت انکی عمر ستر برس تھی (یہ معلومات انکبیٹی علیہ حسن الہضیبی کے ذریعے سے حاصل کی گئیں)

۳۔سیدہ خدیجہ طہ الشعینی (تیسرے مرشد عمر تلمسانی کی اہلیہ)

☆ انکے والد علمائے الازھر الشریف سے تھے۔

☆ آپ بہت خاموش طبع تھیں، بلکہ آپ کے گھر کے ہر گوشے سے سکون پھوٹ رہا ہوتا، وہ اپنے شوہر کے لئے حددرجہ سکون کا اہتمام کرتیں، اور کھلے اور چھپے ہر حال میں اللہ سے ڈرتیں۔

☆ انکے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان کے شوہر اٹھارہ برس تک پس دیوار زنداں رہے، اور آپ نے محبت اور قدر شناسی کے احساس سے یہ تمام وقت کاٹا۔

☆ وہ شوہر کی مثالی فرمانبردار تھیں۔ انہیں کوئی ایسا کام یاد نہیں جس سے انکے شوہر نے انہیں کہا ہو انہوں نے نہ کیا ہو، یا کوئی ایسا کام جسے شوہر نے ناپسند کیا ہو اور وہ اس سے دور نہ ہوگئی ہوں، خواہ وہ موجود ہوں یا نہ ہوں۔

☆ وہ بڑے شوق سے انکی اطاعت کرتیں، اور اسکے ذریعے اللہ کے تقرب کی امیدوار بنتیں، ایک روز جب وہ گھر آئے تو دیکھا کہ چاول جل گئے ہیں انہوں نے اہلیہ سے اسکا سبب پوچھا، تو انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں بتایا کہ وہ ریڈیو سننے میں مشغول تھیں اور چاول جل گئے، شوہر بولے، پھر اس ریڈیو کو بند ہی کردو، اور پھر کئی ماہ گزر گئے مگر انہوں نے ریڈیو نہ کھولا، اور ایک روز اجازت طلب کی کہ وہ ریڈیو پر قرآن کی تلاوت سننا چاہتی ہیں۔ شوہر نے حیرت سے پوچھا، اس روز سے اب تک انہوں نے ریڈیو آن نہیں کیا؟ انکا جواب یہی تھا کہ میں اس کی جرأت کیسے کرسکتی تھی، جبکہ آپ نے منع کردیا تھا۔ وہ مسکرائے اور خوشی سے بولے: میری مالکن اب اسے آن کرلیں۔

☆ انکے شوہر کو ۱۹۷۳ء میں مرشدِ عام کا منصب سونپا گیا، اور انکی اہلیہ اور بچوں کی ماں ۱۹۷۹ء میں وفات پاگئیں، اللہ ان پر رحمت نازل فرمائے آمین۔

(یہ معلومات انکی بیٹی عفیفہ عمر التلمسانی نے فراہم کیں)

۴۔سیدہ زینب علی ابونصر (اہلیہ چوتھے مرشد حامد ابونصر)

☆انکے والد الازھر الشریف میں کام کرتے تھے۔

☆ انکے شوہر کو سزائے موت سنائی گئی۔انہوں نے اس خبر کو اللہ کے ہاں احتساب کے احساس سے سنا، بعد میں سزائے موت کو قید با مشقت میں بدل دیا گیا، انکے شوہر نے انہیں انکے چچا کے ہاتھ ایک خط بھیجا: اگر یہ آزادی چاہیں تو یہ انکا حق ہے، کیونکہ یہ کم عمر ہیں، اور انہیں اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق ہونا چاہیے، آپ بھی اس پر کوئی تنگی محسوس نہ کریں کہ یہ انکا شرعی حق ہے، یہ سب جان کر وہ یقین سے بولی: وہ میرے شوہر ہیں، اور چچازاد بھی ہیں، میرے بچوں کے باپ ہیں، ہرگز ان سے علیحدگی اختیار نہ کروں گی، اور انکا انتظار کروں گی، حتیٰ کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے، جو نافذ ہو کر رہتا ہے

☆انکے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

☆ شوہر کی قید کے بیس برس بعد اور آپ کیا جانیں کہ بیس برس کتنے طویل ہوتے ہیں۔۔۔ اس کے شوہر اکتوبر ۱۹۷۶ء میں رہا ہوگئے اور اسکے نو ماہ بعد جولائی ۱۹۷۷ء میں وہ سراپا صبر خاتون اپنے رب سے ملاقات کو چلی گئیں، اللہ ان پر رحمت فرمائے، آمین

(یہ معلومات ثناء محمد حامد أبونصر نے فراہم کیں جو انکی صاحبزادی ہیں)

۵۔سیدہ زبیدہ عبدالحکیم مشہور (پانچویں مرشد مصطفیٰ مشہور کی اہلیہ)

☆ آپ اخوان کے لٹریچر کا خود بھی مطالعہ کرتیں اور بچیوں کو بھی سکھاتیں۔

☆ آپ کی تین بیٹیاں تھیں۔

☆وہ بیٹیوں سے انکے والد کے بارے میں بات چیت کرتی رہتیں تاکہ انہیں فخر محسوس ہو کہ انکے باپ نے اسلام کا دفاع کرتے ہوئے قید کو قبول کیا ہے۔

☆ وہ سلائی کڑھائی اور کروشیہ میں مہارت رکھتی تھیں، اور اپنی بیٹیوں کیلئے بناتی تھیں، بلکہ اپنے شوہر کے نام سے انکے لئے تحفے تیار کرتی تھیں تاکہ وہ باپ سے جڑی رہیں۔

☆ جب انکے شوہر نے مرشد کا منصب قبول کیا، تو انہیں یہی خبر دی کہ انہوں نے دوسری شادی کر لی ہے، انہوں نے فوراً پوچھا: کس سے؟ وہ بولے دعوت (الی اللہ) سے، وہ مسکرادیں اور بولیں: میں اس دعوت کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔

☆ اسکے باوجود کہ وہ شوہر کی گرفتاری کے بعد اپنے اہل خانہ کے پاس گاؤں منتقل ہوگئیں، انہوں نے باصرار اپنی بیٹیوں کی تعلیم مکمل کروائی۔

☆ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اللہ کے حضور قیام اللیل میں کھڑی رہتیں، تاکہ وہ انکی صحبت میں بھی رہیں اور وہ انکے امام ہوں۔

☆وہ تمام عمر صبر کا عملی مظاہرہ کرتیں رہیں حتیٰ کہ رب کی رحمت نے انہیں اپنے دامن میں سمولیا۔

(یہ معلومات انکی صاحبزادی سلوی مصطفیٰ مشہور نے فراہم کیں)

☆☆☆

کُلُّ مُسلِم .....

مدینہ میں قیام ذہنی توڑ پھوڑ کی وجہ سے بہت خوشگوار نہ رہا۔شاید اسکی وجہ یہ بھی تھی کہ مکہ میں چاروں طرف بازار اور بڑی عمارات دیکھ کر بدمزگی سی محسوس ہوتی۔ بیت اللہ قلبی سکینت عطا کرتا،طواف میں مگن ہوتی تو بہت کچھ بھول جاتا تھا۔لیکن مدینہ میں ایسا سلسلہ نہیں تھا۔مسجد نبوی کے بلند و بالا مینار پاؤں کے نیچے دبیز قالین، انتہا درجے کے قیمتی فانوس، چاروں طرف لوگوں کا ہجوم،شور شرابا، ذہنی یکسوئی کیلئے ایسا گوشۂ تنہائی کہاں سے لاتی جہاں پر سرزمین پر رکھتی اور سب غم بھول جاتی۔ ریاض الجنتہ جانے کیلئے طویل انتظار کبھی بھی پریشانی کا باعث نہیں بنا۔ ہاں عورتوں کے وہاں جانے کے آداب سے ناواقفیت پر دل کڑھتا۔ باری آنے پر ایسے دوڑتیں کہ مسجد نبوی کا صحن اصطبل کا منظر بن جاتا جہاں گھوڑے بگٹٹ بھاگ رہے ہوں۔ دوپٹے کہیں رہ جاتے، دھکم پیل۔

ایک تو اپنے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا، دوسرا ہمارا مجموعی رویہ۔ یہ کس کے در پر جا رہی ہیں؟ ان کو کچھ خبر نہیں؟ انڈو پاک کی خواتین کو لے کر جانے والی منتظمین بیچاری گھنٹہ گھنٹہ کے لیکچر دیتیں، انؐ سے محبت کے تقاضوں میں ادب، احترام، وقار کو ملحوظ خاطر رکھنے پر زور دیا جاتا لیکن حاصل الحصول صفر۔ وہاں پر بھی ہر عورت ''سنہری جالیوں'' کو چُومنا چاہتی، وہ لمبی فہرست جو روضہ رسول پر سلام بھجوانے والوں کی ہوتی ہے وہ ہمراہ ہوتی، عجیب بھگدڑ سی مچی ہوتی۔ بس حسرت ہی رہی رسولؐ اللہ کے روضہ شریف پر سکون اطمینان کے ساتھ حاضری اور ریاض الجنتہ میں نوافل کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بارہا وہاں پر نوافل کی ادائیگی کا موقع ملا لیکن اس عالم میں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ گائیڈ جو انڈو پاک کی خواتین کو لانے لیجانے کی ذمہ دار ہے اس سے اسکے آفس میں ملاقات بھی کی لیکن وہ تو مجھ سے بھی زیادہ بے بس تھی۔ بہت درد سے کہنے لگی۔

''آپ نہیں جانتیں گمراہی اور بدعت کی کیا انتہا ہوتی ہے یہاں لیکن یہ سارا قصور آپ کی حکومتوں کا ہے وہ ان کو تربیت دے کر بھیجا کریں۔ کیا آپ نے ملائشیا، انڈونیشیا کی خواتین کا یہ حال دیکھا؟'' سعدیہ نام کی اس بچی نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔اور پھر خود ہی بتانے لگی۔

''ملائشیا اور انڈونیشیا کے لوگ جب یہاں آتے ہیں تو ان کو پہلے سے ہر چیز سمجھا دی جاتی ہے اس لئے ان کو تو گائیڈ کی بھی ضرورت نہیں۔ کوئی ان کے گروپ کو لے کر نہیں جاتا۔بس تمام گروپس کی ایک نگران ہوتی ہے۔''

مجھے یاد آیا فیصل آباد کے حاجی کیمپ میں جہاں ہمیں رات کے وقت قیام کرنا پڑا تھا فیصل آباد کے بارہ ایک بجے سوئے ہوؤں کو جگا کر ہمارے دینی میٹھے میٹھے بھائیوں نے اڑھائی گھنٹے کا تربیتی پروگرام پیش کیا تھا جس میں مسئلے مسائل، ادب آداب کم اور روضہ شریف کی جالیوں کو چومنے سے لے کر ان کا روباری شخصیات کا تذکرہ زیادہ تھا جنہوں نے کشمیری چائے کے ساتھ کیک رس ابلے انڈے اور بسکٹ اظہار محبت کے طور پر حاجیوں کو پیش کئے تھے!!

رہی ہماری حکومت تو وہ بیچاری اس غم میں ہوتی ہے کہ ہر حاجی سے زیادہ سے زیادہ رقم کیسے وصول کی جاسکتی ہے؟ اس کو کیا ہوش کہ رسولؐ اللہ کے روضہ شریف پر حاضری یا عمرہ کے مسائل پر کیسے بریف کرنا چاہیے۔

سعدیہ سے ملاقات کئی حوالوں سے یادگار رہی۔ اس نے بتایا کہ برصغیر کے لوگ اگر آپؐ سے محبت میں غلو کرتے ہیں تو ایرانی خواتین کا رویہ بہت ہی اذیت ناک ہوتا ہے۔ کچھ حالات وواقعات بھی اس نے گوش گزار کئے۔

بہرحال مدینہ میں قیام کو تیسرا روز تھا۔ مدینہ کا موسم بہت خشک تھا۔ جاتے ہی نزلہ زکام پھر ہاتھ اور منہ پر حد درجہ خشکی پیدا ہوگئی۔ مسجد نبوی میں اے سی کی ٹھنڈک سے بخار ہوگیا۔ بخار نے مجھے بہت ڈرادیا۔ پاکستان سے روانگی ٹائیفائڈ کی مسلسل اکیس دن ادویات لیتے ہوئی تھی اب اتنی جلدی دوبارہ بخار کا حملہ آور ہونا پریشان کن تھا۔ جنت البقیع کے قریب ڈسپنسری سے دوالی۔ ہم لوگ ملاوٹوں کے عادی اتنی خالص ادویات کیسے لے سکتے ہیں، طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ بس مصروفیت یہی رکھی کہ دن میں ایک دفعہ ریاض الجنتہ میں حاضری دی جاتی۔ قرآن کی تلاوت، ذکر اذکار اور نوافل۔ مکہ میں پہنچتے ہی امی کی دوست خالہ ثریا پھر میری اپنی عزیز دوست شہناز کی بہن راشدہ، طائف سے ثمینہ کے علاوہ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہا مگر مدینہمیں ایسے شناسا لوگوں سے رابطہ نہ ہوسکا۔ اسی طرح اور بھی چھوٹے بڑے مسائل تھے لیکن الحمداللہ روٹین برقرار رکھی۔ کوشش یہی ہوتی کہ ریاض الجنتہ کے انتہائی قریب یعنی خواتین کی اگلی صفوں میں رہوں۔ اسکا ایک فائدہ یہ تھا کہ آگے خاموشی ہوتی تھی اور پیچھے سے میرا کوئی تعلق نہ رہتا یوں کچھ نہ کچھ تسلی رہتی۔

یہ شاید پیر کا دن تھا۔ اسی طرح اگلی صف میں بیٹھی تلاوت کررہی تھی کہ موبائل پر جدہ سے عابدہ باجی (عابدہ عمر، نگران حلقہ جماعت اسلامی جدہ) کا فون آیا۔ بالعموم میں حرم میں فون چیک کرتی تھی لیکن اٹینڈ نہیں کرتی تھی۔ ادھر چونکہ ادبی نشست کے سلسلہ میں تبادلہ خیال کرنا تھا لہٰذا میں اگلی صف میں سے جگہ بناتی ہوئی باہر آئی۔ جدہ جانے کے لئے اقامے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں ضروری معلومات دیں۔ فون کال سن کر واپس وہاں آنا بہت مشکل مرحلہ تھا لیکن میرا ایک جوتا وہیں رہ گیا تھا سو جانا پڑا۔ آئندہ جانے والے یاد رکھیں کہ حرم مسجد نبوی کا ہو یا بیت اللہ کا اگر آپ واپس اپنی جگہ پر آنا چاہتے ہیں تو جائے نماز وہیں بچھا کر آیا کریں۔ بہرحال جب واپس وہاں پہنچی تو ہاؤس فل

تھا۔اوپر سے نماز کا وقت قریب تھا۔جگہ دینے پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ اللہ اب کیا کروں، کسی کا دل نہ پسیج رہا تھا کہ مجھے جگہ بنادے۔ایک صحت مند باوقار سی خاتون جو کہ حبشہ کے کسی علاقے سے تعلق رکھتی تھیں۔تھوڑا سا سمٹ کر ایک طرف ہوئیں اور مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

میری آنکھیں تو بھیگنے کو ویسے ہی بے تاب رہتی ہیں۔ میں نے تشکر، جزاک اللہ جیسے الفاظ خوب دل سے ادا کئے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگیں۔''کل مسلم، کل مسلم''

''سوڈان؟''میں نے تکا لگایا

''لا..... جبوتی .....جبوتی'' بہت پیار سے اس نے اپنے وطن کا نام لیا، جیسے بچہ جلیبی کا لیتا ہے۔

''انڈیا؟''اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''باکستان!''میں نے بھی چہرے پر خوشی لانا چاہی لیکن کیا کرتی اس کو ڈینگی وائرس میں چھوڑ کر گئی تھی۔

''اُو.....اُو.....''اس کا چہرہ خوف زدہ ہوگیا۔پھر اس نے لمبی چوڑی گفتگو کی جس میں سے بس ایک لفظ میرے پلے پڑا۔''بوم.....بوم.....''

اب میں اسے کیسے سمجھاتی کہ اتنے بم نہیں پھٹتے جتنے بموں کی اس تک خبر پہنچی۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی، کچھ انگریزی اور کچھ اردو میں اس کو صورت حال کی وضاحت کی اور فرمائش کی کہ عربی بولے ضرور لیکن سپیڈ آہستہ رکھے۔وہ ہنس پڑی۔میں نے اس سے ہمارے ملک کے چپے چپے پہ ہونے والے خودکش بم دھماکوں اور دہشت گردی کی خبروں کا''سورس''دریافت کیا تو حددرجہ اعتماد اور تیقن سے بولیں۔

''انڈیا۔ہندی چینل''

مجھے اسکے جواب پر جو ذہنی کوفت ہوئی اس سے بھی زیادہ کوفت اس بات پر کہ میری عربی پر اور اسکی انگریزی پر اتنی دسترس نہیں تھی کہ میں انڈیا سے اپنے ''خوشگوار'' تعلقات واضع کرتی۔ بہرحال ایک مشرک ملک ہونے کے ناطے''الکفر ملۃ واحدہ'' کا مفہوم میں نے واضع کیا اور بتایا کہ یہ انڈیا کا پروپگنڈہ اور امریکہ کی سازش ہے اسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''ام..... ری .....کا'' اس نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا پھر غیض غضب سے بولی۔''امریکہ.....شیطان کبیر.....فرعون کبیر۔''

میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔امریکہ کی شیطانیت پر جبوتی کی اس بہن کے تاثرات میں اتنی نفرت تھی کہ ایران، افغان، ترکی سمیت سب اس میں اپنے اپنے امریکہ دشمنی کے جذبات شامل کرکے ''ثواب دارین'' حاصل کررہی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا جگہ دینے میں نہ سہی کم ازکم اپنے دشمن کو پہچاننے میں تو اس وقت سب مسلمان متحد ہیں اور''کل مسلم'' کا نعرہ بجا ہے۔اس سے پہلے کہ دشمن کو پہچاننے کے بعد کے مرحلے زیرغور آتے مسجد نبوی کے خوب صورت میناروں سے موذن کی آواز گونجی.....اللہ اکبر.....اللہ اکبر۔

ساری دنیا کی مساجد میں اذانیں ہوتی ہیں..... دلوں کے تار ہلاتی ہیں روح بلالی کو بیدار کرتی ہیں۔لیکن مسجد نبوی کی آواز..... وہ واحد آواز ہے جو چاروں اور ٹکرا کر پلٹ کر روضہ رسولؐ پر حاضری دیتی ہے۔امت مسلمہ کے مسجد نبوی میں اکٹھ پر سرشاری اور مساجد سے باہر انتشار پر شرمساری کی گواہ بن جاتی ہے۔

☆☆☆

جھیلوں کے دیس میں

وقت کسی برق رفتا رگھوڑے کی مانند بھاگتا چلا جارہا تھا۔ میرے شوہر آصف کی ڈاکٹریٹ اختتام پذیر ہونے کو تھی۔ اکثر و بیشتر کھانے کی میز پر سیروسیاحت کا موضوع چھڑ جاتا تھا۔ پہلے پہل تو ان کی اپنی مصروفیت کے پیش نظر انکار کرتی رہی مگر جب ان کو قدرے فراغت کا موقع میسر آیا تو تفریح کی شوقین حس جیسے انگڑائیاں لے کر جاگنے لگی۔ مگر لمبا سفر میرے ایک سالہ بیٹے ہادی بِاَمرِ اللہ کے ساتھ نہ صرف تھکان میں اضافہ کرتا بلکہ اس کی کھیل کود کی روٹین، کھانے پینے اور سونے جاگنے کے اوقات سبھی بری طرح متاثر ہوتے۔ اسی لئے ترجیحاً چھوٹے سفر کا انتخاب مناسب سمجھا۔ مگر موزوں جگہ کا انتخاب پھر ایک سوالیہ نشان تھا!

ہم آج کل بریڈفورڈ میں مقیم ہیں جو کہ خود پہاڑوں کے دامن میں ایک خوبصورت شہر ہے۔ پہاڑوں، وادیوں، جھیلوں، جھرنوں، آبشاروں، دریاؤں، پھولوں، تتلیوں اور خوبصورت پرندوں میں ایک ایسی اچھوتی کشش ہے جو میرے دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس تخلیق کردہ زمین پر موجود خوبصورت نظارے دیکھنے کی تمنا ہمیشہ سے بہت شدید رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس مرتبہ ہم نے Lake District کا انتخاب کیا۔ انٹرنیٹ کی مدد سے مختلف جھیلوں اور وادیوں کی تصاویر اور ضروری معلومات حاصل کیں۔ تصویروں نے ہم پر سحر طاری کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کی کہ اپنی آنکھوں کو ان حسین مناظر سے خیرہ کرنے کیلئے بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔

۱۲ مئی بروز ہفتہ وہ حسین دن تھا جس کو ہم نے تفریح کے لئے منتخب کیا۔ انگلینڈ کا موسم بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے اور اتنا غیر یقینی ہوتا ہے کہ پل میں تولہ اور پل میں ماشہ۔ خوب دعائیں مانگیں کہ سفر شاندار گزرے اور ہفتہ کے دن موسم خوشگوار ہو۔ روز ہی ہلکی ہلکی بارش متواتر ہوتی رہتی جو طلوعِ شمس سے غروب آفتاب تک اور کبھی رات کے پچھلے پہر تک جاری رہتی اور ہوا بھی بے حد سرد ہوتی۔ صد شکر دعائیں قبول ہوئیں اور ہفتہ کو سورج پوری آب وتاب کے ساتھ چمکتا ہوا طلوع ہوا۔ اس کی کرنیں بکھرتے ہی ہمارے چہروں پر بھی طمانیت اور رونق سی پھیلنے لگی۔

آج میں ذرا جلدی اٹھ گئی تھی تاکہ وقت پر روانہ ہوسکیں اور میری طویل کاموں کی فہرست روانگی کے وقت میں باعثِ تاخیر ثابت نہ ہو۔ شیڈول کے مطابق صبح ۹ بجے گھر سے نکلنا تھا اور رات ۹ بجے تک واپسی تھی۔ ان بارہ گھنٹوں میں ان تین

جھیلوں کی سیر مقصود تھی جن کی تفصیلات میں نے گزشتہ روز ایک صفحہ پر محفوظ کر لی تھیں۔ ساتھ لے جانے کے لئے کچھ کھانے پینے کا سامان رکھا اور کچھ ہادی کی چیزیں۔ احتیاطاً گرم کپڑے اور شال بھی رکھ لی تا کہ ٹھنڈ میں سردی سے بچنے کا پورا انتظام موجود ہو۔

ہم تقریباً ۱۰ بجے گھر سے روانہ ہوئے۔ Navigation ہمیں پونے بارہ کا arrival time دے رہی تھی۔ ہادی ہماری سوچ کے برعکس تقریباً سارے راستے جاگتا اور چھوٹی چھوٹی ننھی منی باتوں میں مصروف رہا۔ کبھی مجھے اور کبھی آصف کو بلاتا اور تالیاں بجاتا۔ ہنستے ہنساتے اور چپس کھاتے ونڈرمیئر جھیل (WINDERMERE LAKE) تک کا سفر خیر و عافیت سے مکمل ہوا۔

ونڈرمیئر جھیل:۔

گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی تو سامنے طویل اور خوبصورت جھیل کی لہریں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر ہمیں خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ میں اور ہادی گاڑی میں بیٹھے رہے اور آصف جا کر cruise کا ٹکٹ خرید لائے۔ اس وقت ایک cruise جھیل کے کنارے لنگر انداز تھا۔ کئی سیاح دوسرے cruise سے اتر رہے تھے۔ کئی اس تفریحی مقام پر آرہے تھے اور اگلی کشتی کا انتظار کا ہے تھے۔ ہماری cruise دو منزلہ تھی، جبکہ کھڑکیوں کے ذریعے جو ضرورت کے تحت کھل بھی سکتی تھیں، جھیل کا نظارہ کرنے کا بھی پورا انتظام تھا۔ بالائی منزل پر بھی زیریں منزل کی طرح کرسیاں اور میزیں موجود تھیں جبکہ کھانے پینے کا سامان جہاز میں موجود اسٹور سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ جہاز میں عرشہ بھی موجود تھا۔ جہاں کھڑے ہو کر آپ جھیل کے نظارے کے ساتھ ساتھ کشتی رانی کا مزہ بھی حاصل کر سکتے تھے۔

ونڈرمیئر جھیل انگلینڈ کی طویل ترین جھیل ہے جس کی لمبائی ساڑھے دس میل، چوڑائی ایک میل اور گہرائی ۲۲۰ فٹ ہے۔ کئی دریاؤں کا پانی آ کر اس جھیل میں گرتا ہے۔ رومیوں نے اس جھیل کے شمالی کنارے ''واٹر ہیڈ'' پر قلعہ گلاوہ تعمیر کروایا۔ کئی وزنی سامان کے نقل و حمل کے لئے بھی یہی جھیل استعمال کی جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں کئی امیر کاروباری حضرات نے جھیل کی دیکھ بھال کے لئے یہاں متعدد عظیم کوٹھیاں تعمیر کیں جو اب ہوٹلوں اور ریستورانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

ہم خراماں خراماں آبی گزرگاہ کی جانب بڑھے۔ موجیں اور ساحل کی ٹھنڈی ہوائیں ہمیں ابھی سے جادونگری کا مسافر بنا چکی تھیں۔ ہم جہاز کے زینے کے ذریعے عرشے تک پہنچے ہی تھے کہ آصف کی پرزور فرمائش پر چھت پر موجود کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ کھلی فضا میں بیٹھ کر جھیل کے سفر سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ شروع میں تو میں بھی بخوشی بیٹھی رہی مگر جب جہاز چلنے لگا تو ہوا کی ٹھنڈک نے مجھے زیر زمین منزل پر جانے پر مجبور کر دیا۔ مجھے موسم کی ٹھنڈک کا اندازہ صحیح طور پر نہ ہو سکا۔ میری جیکٹ اور شال بھی گاڑی میں رہ گئی تھی۔ اپنی قلفی جمواتے سے بہتر تھا کہ میں نچلی منزل میں چلی جاؤں۔

میرے پیچھے آصف اور ہادی بھی نیچے اتر آئے۔ مگران سے رہا نہیں جا رہا تھا اور بار بار عرشے پر جانے کے لئے بضد تھے۔ اسی اثنا میں کچھ برطانوی مسافر بھی زیرِ زمین منزل میں آنے لگے۔ کچھ کے ساتھ پالتو کتے بھی تھے۔ آصف فون پر میری ماما سے بات کر رہے تھے اور ہادی اپنی دنیا میں مست تھا۔ اتنے میں پالتو کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ ہادی نے اپنی زندگی میں پہلی بار کتوں کو بھونکتے ہوئے سنا اور دیکھا تھا وہ بھی اتنے قریب سے۔ اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ آصف نے جھٹ فون مجھ کو دیا اور ہادی سمیت عرشے پر جا پہنچے۔ یوں سمجھئے کہ ان کو بالآخر باہر جانے کا موقع مل گیا تھا۔ ہادی بھی اپنے ابی کے ساتھ جھیل کی لہروں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ میں نے اکیلے بور ہونے کے بجائے ان کے پاس باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ باقی کا سفر ہم نے عرشے پر کھڑے ہو کر گزارا۔ cruise دورانِ سفر دو مختلف مقامات پر رکا جہاں مزید مسافر اور سیاح موجود تھے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ہم نے یہ یادگار سفر کیا۔ موسم نہایت سہانا تھا۔ دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مگر ہوا پھر بھی سرد تھی۔ اگر بارش ہو رہی ہوتی تو شاید عرشے پر کھڑا ہونا ناممکن ہو جاتا۔

زینے سے واپس جب آبی گزرگاہ پر قدم رکھا تو اس جھیل کے سفر کے اختتام نے ملی جلی سی کیفیت پیدا کر دی۔ کچھ خوشی تھی کہ کتنا زبردست تجربہ رہا اور کچھ اداسی کہ اب ہمیں اگلی جھیل کی طرف جانا ہے جہاں کشتی رانی کی ایسی سہولت میسر نہیں۔ ہادی کو بہت بھوک لگ رہی تھی اور ہمیں کھانے کی بے حد طلب محسوس ہو رہی تھی۔ گاڑی میں آتے ہی ہادی کو دلیہ کھلایا اور خود سینڈوچز کھائے۔ ساحل سے ٹکراتی لہریں ہمارے مزے کو دوبالا کر رہی تھیں۔

دوپہر تین بجے ہم نے اگلی جھیل کی جانب گاڑی کا رخ موڑا۔ یہ جھیل ونڈرمیئر جھیل سے آٹھ دس منٹ کے فاصلے پر ہے۔ اس Lake District میں تقریباً پندرہ کے قریب جھیلیں موجود ہیں جن میں سے کچھ آس پاس اور کچھ قدرے فاصلے پر ہیں۔

گراس میئر جھیل (GRASMERE LAKE)

گراس میئر کمبریا (CUMERIA) کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہاں معروف انگریزی شاعر ولیم ورڈزورتھ کا آبائی گھر بھی موجود ہے جہاں وہ اپنی بہن ڈورتھی کے ہمراہ ۱۷۹۹ سے ۱۸۰۸ تک قیام پذیر رہا۔ یہ تمام علاقہ اب سیاحت کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ یہاں کئی گفٹ شاپس، ہوٹل اور ریستوران موجود ہیں۔ یہاں کا گرجا گھر تیرہویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا جبکہ دیگر عمارتیں انیسویں اور بیسویں صدی کی ہیں۔ ولیم ورڈزورتھ نے ۱۸۵۰ میں انتقال کیا اور اس کا مقبرہ St. Dswald,s church کے احاطے میں موجود ہے۔ گراس میئر کے بارے میں ولیم ورڈزورتھ نے کہا تھا:

The Loveliest spot the man hath everfound

یعنی یہ وہ خوبصورت ترین جگہ ہے جو کبھی انسان کو ملی ہو۔

گراس میئر جھیل کی لمبائی ایک میل، چوڑائی آدھا میل اور گہرائی ۵۷ فٹ ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں بنی جھیل کے گرد فٹ پاتھ بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ تاکہ آپ اس کے کنارے چہل قدمی کر کے لطف اندوز ہوسکیں۔ یہاں کچھ دیر رکنے کے بعد ہم نے تیسری جھیل کی جانب رختِ سفر باندھا۔

واسٹ واٹر جھیل (VASTWATER LAKE)

آصف نے سن رکھا تھا کہ اگلی جھیل کی طرف جانے والے راستے انتہائی تنگ اور دشوار گزار ہیں۔ جہاں ایک گاڑی گزرنے کے لئے دوسری گاڑی کو یا تو کافی دیر رکنا پڑتا ہے یا reverse کرنا پڑتا ہے۔ گھر سے ونڈر میئر تک اور اب گراس میئر تک سڑکیں کشادہ تھیں مگر کچھ ہی میل سفر کرنے کے بعد ہمیں بھی انہی تنگ سڑکوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پہلے پہل تو سڑک سیدھی رہی مگر پھر تو جیسے سڑک نے ہمیں چکراہی ڈالا۔ کبھی چالیس اور کبھی پنتالیس کے زاویے سے اوپر چڑھتی اور کہیں ایک دم نیچے کو آجاتی۔ یہ سارا سفر پہاڑوں پر بنی ہوئی اس تنگ سی سڑک پر محیط تھا۔ کہیں سڑک بائیں اور کہیں دائیں مڑتی۔ کئی جگہ blind spots بھی آئے جب میں آگے بیٹھی تو مجھے یہ سارا سفر خوب لطف دے رہا تھا اور میں قدرتی مناظر کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔ مگر ہادی کے فیڈر کا ٹائم ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے اب پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ہادی کبھی مجھے اور کبھی آصف کو آوازیں دے رہا تھا اور کبھی بھوک سے رونے والی شکلیں بنا رہا تھا۔ آصف کسی مناسب مقام کی تلاش میں تھے جہاں وہ گاڑی روکیں اور میں پیچھے چلی جاؤں۔ اتنے میں دو موٹر سائیکل سواروں نے جو سامنے آرہے تھے ہمیں روکا۔ وہ گاڑی کے indicators سے سمجھ چکے تھے کہ ہم یہاں سے دائیں جانب مڑ رہے ہیں۔ وہ بھی دائیں جانب سے ہی آئے تھے۔ آصف نے گاڑی روکی تو انہوں نے بتایا کہ آپ اس طرف نہ جائیں، بائیں مڑ جائیں کیونکہ آگے راستہ سڑک پر ہونے والے حادثے کی وجہ سے بند ہے اور ہم بھی وہیں سے واپس مڑ کر آئے ہیں۔ آصف نے گاڑی بائیں جانب موڑ لی جس کی وجہ سے ہمارا arrival time جو navigation پر آرہا تھا مزید ۲۰ منٹ متاخر ہو گیا۔

آصف نے مناسب جگہ گاڑی روکی اور میں ہادی کے پاس پیچھے جا بیٹھی اور فیڈر پلانے لگی۔ سڑک اسی طرح کبھی اوپر کبھی نیچے اور کبھی دائیں بائیں گھومے چلی جارہی تھی۔ پہلے پہل تو میں ٹھیک ٹھاک تھی مگر جب ان چکروں کی شدت میں اضافہ ہونا شروع ہوا و میرا دماغ بھی چکرا گیا۔ ایسی شدت کے چکر آئے کہ میں نے ہادی کا فیڈر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ کبھی کھڑکی کھولتی، کبھی آنکھیں بند کرتی اور سر جھکا لیتی۔ آصف مسلسل گاڑی چلا رہے تھے اور گاڑی روکتے ہوئے ڈر رہے تھے کیونکہ ہم سنسان پہاڑوں اور جنگلوں کے درمیان سفر کر رہے تھے جہاں جانور آزادانہ پھر رہے تھے۔ درختوں

نے سڑک پر قدرے چھاؤں کر رکھی تھی۔ کہیں سے بھیڑیں اور کہیں سے بیل نمودار ہوتے اور بے فکری سے آزادانہ آتے جاتے جیسے وہ ان گاڑیوں کے عادی ہو چکے ہوں۔

ہم آہستہ آہستہ بلندی پر جا رہے تھے۔ ایک وقت آیا کہ پہاڑ بالکل سیدھے ہو گئے اور ہم اس سڑک پر سفر کر رہے تھے جو پہاڑوں کے اوپر بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی بلندی کی وجہ سے کان بھی بند ہو جاتے تھے اور اب جب سورج کی تیز شعاعیں ان پتھریلے پہاڑوں کو تپانے لگیں تو میرے چکر بے قابو ہونے لگے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ میں جھیل تک کس حال میں پہنچوں گی۔ یہاں کے پہاڑوں نے ماحول کو خوفناک بنا رکھا تھا۔ ایسے میں ایک سڑک آئی جس کے بائیں جانب دیو قامت پہاڑ اور دائیں جانب گہری کھائی میں گہرے نیلے رنگ کی جھیل جس کے ساتھ بھورے رنگ کا عظیم الشان پہاڑ تھا۔ اس خوفناک منظر نے نہ صرف میرے بلکہ آصف کے بھی اوسان خطا کر دیئے۔ جھیل کا پانی اتنا نیلا تھا جیسے کسی نے اس میں گہرے نیلے رنگ کی سیاہی پھینک دی ہو۔ آگے ہی ہمارے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ اب تو میرا دل تھا کہ آصف کسی نہ کسی طرح گاڑی اس جھیل سے دور لے جائیں۔ کئی لوگوں نے گاڑیاں روکی ہوئی تھیں مگر آصف قدرے فاصلے پر ایک میدان میں گاڑی لے آئے اور گاڑی روکی۔

ویس ڈیل وادی میں واقع واسٹ واٹر جھیل ۳ میل طویل، آدھ میل چوڑی اور ۲۶۰ فٹ گہری ہے۔ واسٹ واٹر جھیل لیک ڈسٹرکٹ میں واقع تمام جھیلوں میں سب سے زیادہ خوفناک اور سحر انگیز سمجھی جاتی ہے۔ یہ انگلینڈ کے بلند ترین پہاڑوں ریڈ پائک (REDPIKE) کرک فیل (KIRK FELL)، گریٹ گیبل (GREAT GABLE) اور سکیفل پائک (SCAFELL PIKE) کے دامن میں واقع ہے۔ یہ جھیل سطح سمندر سے تقریباً ۲۰ فٹ بلند ہے اور جھیل کی تہہ سمند کی تہہ سے ۵۰ فٹ گہری ہے۔ یہ جھیل انگلینڈ کی گہری ترین جھیل ہے۔

ہم کچھ دیر اس بھوت پریت کی وادی میں تصویر کشی میں مصروف رہے اور کیمرے کی آنکھ میں ان خوفناک پہاڑوں اور واسٹ واٹر جھیل کی عکس بندی کی۔ گاڑی رکنے سے میری طبیعت بھی قدرے سنبھل چکی تھی۔ کچھ ہوش آیا تو کھانے کا بکس کھول کر بیٹھ گئے۔ انگلینڈ میں رہنے کے باوجود یہاں سے کئی پاکستانی اشیا بھی ملتی ہیں جن میں نمک پارے بھی شامل ہیں۔ آصف چپس اور میں اور ہادی نمک پاروں سے لطف اندوز ہوئے۔ اس جنوں کی وادی سے جلد از جلد نکلنا از حد ضروری تھا ورنہ اندھیرے کی صورت میں واپسی کا سفر مزید بھیانک ہو جاتا۔ اب کے جب گاڑی واپس انہی گول چکروں سے گزرنے لگی تو میں سر تھامے بیٹھ گئی۔ خدا کی قدرت سے واپسی کے لئے ہماری navigation نے مختلف راستے کا اشارہ دیا، تو ہماری جان میں جان آئی کیونکہ سڑک اب کافی حد تک بہتر، کشادہ اور سیدھی ہو چکی تھی۔ آہستہ آہستہ ہم پہاڑوں سے نکل کر

سیدھی سڑک پر اتر آئے۔ دور سے ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آ رہا تھا۔ جس سڑک پر ہم سفر کر رہے تھے وہ انگلینڈ کے مغرب میں شمالی بحرِ اوقیانوس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ شام کے سات بج رہے تھے اور navigation ہمیں نو بجے کا arrival time دے رہی تھی۔ کبھی گھر کی یاد شدت سے آنے لگتی تو کبھی جھیلوں پر گزرے لمحوں کی۔ سارا راستہ سفر پر تبصرہ کرتے ہوئے گزرا۔ ہادی کو کھلانے کے لئے میں پھر پیچھے جا بیٹھی تھی۔ ہادی کے کچھ کھلونے میں ساتھ لے گئی تھی۔ واپسی کا بقیہ ایک گھنٹہ میں نے ہادی کیساتھ کھیلتے ہوئے گزارا۔ آصف ہادی سے باتیں کرتے رہے اور ہادی اپنی زبان میں ابی سے اپنی باتیں کرنے میں مشغول رہا کچھ ہی دیر بعد سائن بورڈ پر بریڈفورڈ لکھا نظر آیا تو جیسے ساری تھکن ہوا ہوگئی اور گھر قریب آنے کی خوشی سے ہم دونوں میں گویا جان سی آ گئی۔ چند ہی منٹ بعد ہم اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ سارے چکر اور تھکن بھول چکے تھے۔ سامان گاڑی سے نکال کر اسی لمحے ترتیب سے بھی رکھ دیا۔ تصویریں دیکھیں اور اس یادگار سفر کے لمحات کو یاد کرنے لگے۔

جیسے ہماری یادوں کے گلستان میں ایک نئے پھول کا اضافہ ہوا ہو جس کی انتہائی مسحور کن خوشبو گلشن میں مہک اور نکہت بکھیر دے۔ جیسے یادوں کی حسین مالا میں ایک نئے چمکدار موتی کے اضافے سے چار سو آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی پھوٹنے لگے۔ ویسے ہی ہماری زندگی کے اس حسین سفر میں ایک نئے لمحے کی یادیں شامل ہو چکی ہیں۔

St.Augustine (رومی افریقہ سے تعلق رکھنے والے لاطینی فلسفہ نگار) کے مطابق: (ترجمہ) ''دنیا ایک کتاب کی مانند ہے اور وہ جو سفر نہیں کرتے صرف اس کے ایک صفحے کو پڑھتے ہیں۔''

جبکہ Lin Yutang (چینی موجد و مصنف) کا نظریہ ہے کہ: (ترجمہ) ''کوئی سفر کی خوبصورتی کو تب تک نہیں جان سکتا جب تک وہ (سفر کے بعد) گھر واپس نہ لوٹ آئے اور اپنے پرانے تکیے پر آرام نہ کرے۔''

ہم جب بھی اب اپنی یادوں کی کتاب کے صفحات پلٹا کریں گے تو لیک ڈسٹرکٹ میں بیتے لمحوں کا سحر اور اس جادو نگری کا طلسم ہمیں اپنا اسیر کر لیا کرے گا۔

☆☆☆

شاہدہ اسلم

روشن ستارہ

حلقہ خواتین جماعت اسلامی ضلع ملتان کی پہلی رکن بزرگ رہنما مسعودہ بیگم مرحومہ کی یاد میں

رہ کے دنیا میں کسی کو نہیں زیبا غفلت
موت کا دھیان بھی لازم ہے کہ ہر آن رہے
جو بشر آتا ہے دنیا میں یہ کہتی ہے قضا
میں بھی پیچھے چلی آتی ہوں ذرا دھیان رہے

میں کوئی لکھاری نہیں ہوں اور نہ ہی میرے پاس الفاظ کے قیمتی خزانے ہیں لیکن خالہ جان کی جدائی کا دکھ بلاشبہ ایسا ہے جس نے میرے قلم کو زبان دے دی ہے اور وہ روانی سے بہتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے قلم میں روانی تب آئی تھی جب میری والدہ صاحبہ اس دنیا کو داغ مفارقت دے گئی تھیں، تب انکے بارے میں میں نے لکھا اور خالہ جان کو دکھایا تو بے انتہا خوش ہوئیں اور کہنے لگیں اس مضمون کو بتول میں بھیجو۔ اب ایک مرتبہ پھر دل کو ٹھیس پہنچی تو دوبارہ قلم کو زبان مل گئی۔ کئی مرتبہ سوچا کہ اس عظیم ہستی کے کردار کی جھلک بتول کے قارئین کو بھی دکھاؤں تا کہ دوسرے اس سے راہ عمل پا سکیں یہی سوچ کر میں نے اپنے حوصلے کو جمع کیا اور قلم اٹھایا۔

ایک موحد اور متوکل الی اللہ ہونے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو انکی بنیادیں بہت مضبوط تھیں۔ ان میں جو اعلیٰ اوصاف تھے وہ کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں انتہائی خوددار، حیادار، بہترین رازدار، صدقہ کرنیوالی، ایثار پسند، خوش اخلاق اور سادگی پسند خاتون تھیں۔ سلیقہ شعار، قناعت پسند تھیں، حلال کمائی کو ترجیح دینا انکی خوبیوں میں سے ایک ہے۔ آپ بہترین راہبر و راہنما تھیں مجھے تحریک کیساتھ منسلک کرنے میں ان کا ہاتھ ہے۔ مجھے اکثر کہا کرتیں میں نے اپنے سسرالی رشتہ داروں کو اجتماعیت کیطرف لانے کی بہت کوشش کی ان میں سے اللہ تعالیٰ نے آپکی صورت میں گوہر نایاب عطا فرمایا اور یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آجاتے کہ اگر اتنی کم علمی کے باوجود خالہ جان کے لئے اہم ہوں تو کاش اللہ تعالیٰ میری معمولی کاوشوں کو شرف قبولیت بخشے، میں اللہ رب العزت کو پسند آجاؤں اور آخرت میں جہنم سے نجات پا جاؤں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں جمالپورہ کالونی میں رہتی تھی، اکثر بیگ کندھے پر ڈالے مسکراتی چلی آرہی ہوتیں۔ بڑی محبت اور پرخلوص انداز سے ملنا، دعائیں دینا، بچوں کا حال احوال اور پھر روزمرہ کی مصروفیت کے بارے میں پوچھنا اور ساتھ ہی بیگ میں سے خرم مراد صاحب اور مولانا مودودیؒ کے کتابچے نکالنا اور مجھے کہنا ذرا مجھے پڑھ کر سنائیں (حالانکہ انکا مطالعہ انہوں نے کیا ہوتا تھا) پھر میں وہ پڑھ کر سناتی اور اتنی دیر میں جو

سبزی میں بنارہی ہوتی وہ بناتی رہتیں۔ اگر میں منع کرتی تو کہتیں پھر کیا ہوااس لئے بنارہی ہوں کہ کھانا بنانے میں دیر نہ ہوجائے۔ پھر کتابچہ ختم ہونے کے بعداس پر ڈسکشن ہوتی، سوالات کئے جاتے اور میں اپنی معمولی قابلیت کے لحاظ سے جواب دیتی اور پھر بڑے اچھے انداز سے مجھے سمجھاتیں۔ اسطرح مجھے بھی تحریک کے سفر میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس اجتماعیت نے ہمیں سنوارا ہے اور اسکو سنوارنے کیلئے ہم نے خودکوگھلانا ہے اوراپنی تمامتر صلاحیتوں کو اللہ کی رضا کیلئے استعمال کرنا ہے،انشاءاللہ۔

ہم جب بھی انکے پاس بیٹھتے تو دنیا کی باتیں کم اوردین کی باتیں، احادیث اور مسئلے مسائل سننا اور سنانا زیادہ پسند کرتیں، دینداری کے مرتبہ پر ہوتے ہوئے بھی انکے مزاج میں نہ سختی تھی، نہ رہبانیت، تربیت کرنے کا بھی انکاایک الگ ہی انداز تھا،انہوں نے کبھی کسی چیز سے حکماً نہ کبھی روکا نہ کرنے پر اصرار کیا۔ وہ معاملے کے دونوں پہلو سامنے رکھ کر دلچسپی لیتیں اور شامل گفتگو ہوتیں۔ انکی بات چیت میں شگفتگی اوراعلیٰ ظرفی تھی یہی وجہ تھی کہ جوان سے ملتا انکے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ انکی ذات میں ایک خاص کشش اور چہرے پر نورانیت تھی جو زندگی کے آخری لمحات تک رہی۔ سادہ لباس زیب تن کرتیں۔ سادگی انکا شیوہ تھا۔

دعوت الی اللہ اور تبلیغ دین کی خاطر ملتان کا گرم موسم اور پیدل چلنے کی مشقت کبھی انکی راہ میں رکاوٹ نہ بنی۔ وہ جہد مسلسل کے ساتھ زندگی کواخروی کامیابی کی خاطر استعمال میں لاتی تھیں ہاں البتہ آخری عمر میں بیساکھی کیساتھ چلتیں۔ طبیعت ذراسی سنبھلتی تو اجتماع ارکان میں بڑی ہمت اورلگن سے شرکت کرتیں اور نقاہت کے باجود آرام کو ترجیح نہ دیتیں۔

انتہائی زندہ دل،خوش مزاج،منکسرالمزاج،خوف خدا سے معمور دل رکھنے والی اور سنت پر عمل پیرا ہونے والی تھیں۔ ہمیشہ سلام میں پہل کرنے کی کوشش کرتیں۔ عاجزی کا پیکر، تکبر سے کوسوں دور، ہر ایک سے احترام سے بات کرنیوالی تھیں۔

تیرے نقش قدم پہ میں بھی چلوں
میرے دل میں یہ کتنا ارماں ہے

اللہ کریم نے انہیں روشن دماغ اور روشن ضمیر عطا کیا تھا انکے دل ودماغ میں حیرت انگیز توازن محسوس ہوتا تھا۔ انہیں کبھی آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا۔کبھی ناشائستہ گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا وہ ہمارے اجتماعات کا ایک قابل قدر فرد تھیں۔ ہر بات میں غور وفکر اچھے لوگوں کی صحبت اور اچھی کتب کے مطالعے نے انہیں کندن بنادیا تھا۔انکی طبیعت میں ایک خاص قسم کا ضبط تھا۔انکے عزیز واقارب یا حلقہ احباب میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کو ان سے کوئی شکوہ شکایت ہو۔

ایک وقار،تہذیب اور شائستگی انکی ذات سے نمایاں محسوس ہوتی تھی۔ جماعت اسلامی کا جگمگاتا ہوا ستارہ تھیں۔

اللہ تعالیٰ سے محبت، توکل اور اپنی دعاؤں پر اعتماد تھا۔ قرآن پاک کو اپنے دل کی بہار، سینے کا نور اور آنکھوں کی ٹھنڈک بنا لیا تھا اور دم واپسیں ان کا روشن چہرہ دیکھ کر دل بے اختیار پکار اٹھا کہ اللہ کے پسندیدہ دوست ایسے ہی ہوتے ہیں جن کیلئے اللہ رب العزت کا وعدہ ہے۔

میں کم علم ناچیز اور حقیر سی بندی یہ چاہتی ہوں کہ میرا ان سے اور انکی اولاد سے یہ دینی تعلق تا قیامت قائم رہے۔ مجھے ان سے دینی رہنمائی ملتی رہے اللہ کرے میرا اور ان کا رشتہ جنت میں بھی رہے انکی نیکیوں کو جاری وساری رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کیلئے آسانیاں مہیا کرے بلکہ روحانی اولاد (ہم سب) کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنادے آمین۔ اللہ کرے ان سے جنت کے باغوں میں ملاقات ہو۔

☆☆☆

زندہ دلانِ قوم

موسیقی کی دھمک مجھے اپنے دل کی دھڑکن سے آتی محسوس ہورہی تھی۔ ساز کے ساتھ بجتے قومی ترانے نوجوانانِ وطن کو مسحور کئے جارہے تھے۔ میری نگاہوں کے سامنے محبان وطن، وطن کی محبت سے سرشار محو رقص تھے۔ دائیں جانب بیٹھی عزیزہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا ''جذبات کے اظہار میں پاکستانیوں کا کوئی ثانی نہیں، ہیں نا؟'' گویا اس نے تصدیق چاہی۔ دل زور سے دھڑکا۔ پلکوں کے کنارے بھیگتے محسوس ہوئے۔ جسم و جان لرز گئے، پرنم آنکھیں ''بابِ آزادی'' کی طرف اٹھ گئیں، ہجرتیں، شہادتیں، آبروئیں اور پھر.....آزادی۔ میری سوچ کے گردان تصورات کا حصار تنگ ہوتا جارہا تھا۔ آزادی کی رات تو آج تک اپنی فتح کا جشن منانے کے لئے تڑپ رہی ہے۔

واہگہ بارڈر کے سٹیڈیم میں بلند ہوتے نعرۂ تکبیر نے میری سوچوں کا سحر توڑا۔ ہاں! جذبات کے اظہار میں میری قوم ثانی نہیں رکھتی۔ اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کی گونج یہ ثابت کررہی تھی۔ میری قوم بہت سادہ دل ہے، نعروں پر دل لبھاتے نوجوانانِ رعنا مثال پیش کررہے تھے۔ میری قوم نے زندہ دلی میں ہر قوم کو شکست دی ہے، شور مچا کر، ہُو ہا کی آوازیں لگا کر فوجی جوانوں کا حوصلہ بڑھاتے بچے، بڑے مرد و زن اپنے فن کا مظاہرہ کررہے تھے۔

مجھے اپنی قوم، اپنے وطن سے بے پناہ اور بے لوث محبت ہے، میری طرح میری قوم کے ہر بچے، بوڑھے اور جوان کو بھی اپنی قوم سے بے پناہ محبت ہے۔ ثبوت لے لو! جب قوم پہ خوشی کا وقت آتا ہے تو سب اپنے اگلے پچھلے غم بھول کر، ایک ہو کر اس خوشی کو مناتے ہیں۔ پھر وہ اس میں ایسے مست ہوتے ہیں کہ انہیں یاد نہیں رہتا کہ دیار غیر میں قوم کی کوئی ناموس بند سلاخوں کے پیچھے سسک رہی ہے یا قوم کے سینے پر کاری ضرب لگانے والا گورا اپنے جیسے سیاہ کاروں میں لوٹ گیا ہے۔ پھر وہ سرحد پار سے آنے والے خون میں لتھڑے بے گناہ لاشے کو بھی یاد نہیں کرتے۔ خوشی ایسے ہی تو منائی جاتی ہے۔ سب غم بھول کر، ہنستے چہروں کے ساتھ ہنس کر، ماضی کے دکھڑے لئے بیٹھے رہیں تو روشن مستقبل کی راہ نظر نہیں آتی۔ ہر درد بھلانا پڑتا ہے۔

اور جب قوم پر کوئی دکھ کی گھڑی آجائے تو سب مل کر اس مصیبت، اس آزمائش کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ہاں..... یہاں یہ بھی سن لو! مسیحائی میں بھی میری قوم کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ کسی ایک فرد پہ کوئی غم ٹوٹے تو ساری قوم جلاؤ گھیراؤ میں اسکا ساتھ دیتی ہے۔ آدھی قوم ''بدلہ لیں گے'' کے لئے جلوس کا اہتمام

کرتی ہے تو آدھی قوم ''مطالبات مانے جائیں'' کے لئے مظاہرے کرتی ہے۔ دھرنے دیئے بیٹھی ہوتی ہے۔ اتحاد اور کسے کہتے ہیں؟ یہی تو ہے نا اتحاد! یہی تو ہے قوم کے لئے دردمندی کا احساس!!

ایک بار پھر سٹیڈیم سے اٹھتے ہوئے شور نے مجھے سوچوں کے گرداب سے باہر نکالا۔ پرچم اتارا جاچکا تھا کچھ دیر بعد.....سورج غروب ہونے کو تھا۔ میرے لرزتے ہونٹ اپنی قوم کی بگڑی ہوئی تقدیر کے لئے دعا گو تھے۔ دل کی دھڑکنیں آمین کہہ رہی تھیں۔ میری نظریں آخری بار پھر ''بابِ آزادی'' کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ شکوہ کناں تھا.....میں ٹھٹھک گئی.....وہ میری قوم کی سادہ دلی پر ماتم کررہا تھا فرط جذبات سے مغلوب ہوکر نعرے لگانے والی قوم پر آنسو بہارہا تھا۔ بے اختیار میری نظر دیوار پر کندہ حروف پر جاپڑی ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' میرا سر جھک گیا۔ دل اک بوجھ سا لئے بیٹھ گیا۔

نہیں.....! میری قوم تو حب وطن کے جذبے سے سرشار ہے۔ مگر ہاں! کوئی بھول ہوگئی ہے.....ہم سے کوئی بھول ہوگئی ہے۔

ہم آزادی کا حق ادا کرنا بھول گئے ہیں۔ ''بابِ آزادی'' کے اس پار ہجرت کے وقت ظلم وبربریت کی جو داستان رقم ہوئی تھی، اس کا فقط ایک ہی حاصل تھا۔ اللہ اور اسکے رسول کی غلامی! ہاں.....آزادی کا حق تو یہ تھا۔ ''ابھی بھی وقت ہے۔ مجھے محبانِ وطن کو یہ حق یاد دلانا ہے۔'' یہ سوچتے ہوئے میرے قدم تیزی سے باہر کی جانب اٹھنے لگے۔

سنو! جذبات کے اظہار میں میری قوم ثانی نہیں رکھتی۔ مجھے اپنی قوم، اپنے وطن سے بے پناہ اور بے لوث محبت ہے لیکن محبت کے اظہار کا جو روپ آج میرے سامنے آیا تھا وہ میری روح کو کچوکے لگا رہا تھا۔ میں نے بوجھل قدموں کے ساتھ واہگہ بارڈر چھوڑتے ہوئے جب پلٹ کر الوداعی نگاہ ڈالی تو ڈھول کی تھاپ پر جھومتا ہوا نوجوانوں کا جم غفیر دیکھ کر میرا زخمی دل بے اختیار دہائیاں دینے لگا۔

؎ چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی!

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر صوفیہ

میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟

سویڈن سے تعلق رکھنے والی نومسلمہ کے خیالات

میں نے ایک کٹر عیسائی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میری والدہ ہمیں ہر ہفتے چرچ میں لے جانے کی کوشش کرتی تھیں، جبکہ میرے والد ریاضی کے استاد تھے۔ وہ بہت مذہبی نہیں تھے میں اپنی تعلیم کے دوران حیران و پریشان رہا کرتی تھی، کیونکہ محض رسم ورواج اور چرچ میں حاضری کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں ایمانیات اور توحید سے متعلق بعض ایسے سوالات آتے تھے، جن کا جواب چرچ کے پاس نہیں تھا۔ پھر میں نے ناروے کی اوسلو یونیورسٹی میں مذہبی علم کے شعبے میں داخلہ لیا۔ وہاں تاریخ اور تقابل ادیان کے لئے گہری نظر سے مطالعے کے باوجود میں اسلام کے متعلق بدظنی کا شکار رہی۔ اسلام کو سمجھنے کے لئے میں جو کتابیں پڑھی تھیں، وہ صحیح نہیں تھیں، کیونکہ وہ مستشرقین کی لکھی ہوئی تھیں۔ آخر میں مجھے سید مودودیؒ کی کتاب ''دینیات'' پڑھنے کو ملی اور سید قطب مصریؒ کی ''معالم فی الطریق'' کا انگریزی ترجمہ ملا، جن سے مجھے اپنے سوالات کا تسلی بخش جواب ملا۔ اس کے بعد میں نے ان کتابوں کو پڑھنا شروع کیا جنہیں مسلمان علما نے لکھا ہے۔ قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ خریدا اور اس کی آیات پر غور وخوض شروع کر دیا۔ جب میں اسلام کے متعلق پوری طرح یک سو اور مطمئن ہوگئی تو اسلام مرکز گئی اور کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔

میرے رشتے داروں نے اسے معمول کی بات سمجھ کر کوئی خاص توجہ نہیں دی، لیکن میری چند سہلیوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا، خصوصاً جب میں نے یونیورسٹی میں حجاب کرنا شروع کر دیا تو بعض دوستوں نے میرے ساتھ بحث ومباحثے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

نئی چیز ہمیشہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہے اور شروع میں یقیناً بعض مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اب تو پردہ عام ہو چکا ہے۔ مجھے مشکلات کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ لوگوں کو ہدایت کے لئے دعا کریں اور اس راستے میں آنے والے مصائب کو صبر وتحمل سے برداشت کریں۔ الحمدللہ! حجاب کے سلسلے میں کوئی خاص مشکل نہیں ہے۔

میں نے اپنی تمام سہیلیوں کو اسلام کی دعوت دی ہے اور ان میں سے بعض نے اسلام قبول بھی کر لیا ہے لیکن میری شادی کے بعد کافی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ میرے خاوند مجھ سے کہتے ہیں کہ جب تم نے خیر کو پالیا ہے تو اسے دوسرے تک بھی پہنچاؤ۔ عربی سیکھنے میں انہوں نے میری بڑی مدد کی۔ الحمدللہ، میرے پاس روزانہ کی مصروفیات تدریس، لیکچرز، ٹیلی ویژن پروگرام

اور دیگر پروگراموں میں شرکت پر مشتمل ہیں۔

اولاد کی تربیت سب سے اہم کام ہے اور اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ دیگر طلبہ کی طرح ہمارے بچے بھی سویڈش اسکول میں جاتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ آموختہ کرتی ہوں اور ان کے ساتھ گفتگو کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ عربی سیکھنے کے لئے ویڈیو کیسٹ دیکھتے ہیں۔ نمازوں اور ذکر کے اہتمام کے ساتھ سونے سے پہلے ہم انہیں کوئی ایک آدھ اسلامی قصہ سناتے ہیں اور بعض نصیحتیں کرتے ہیں۔ ہر ہفتے کے آخر میں عربی پڑھنے اور سیکھنے کی مشق کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ بچوں کے اخلاقی اور تعلیمی امور بہت اچھے ہیں اور وہ عربی، سویڈش اور ناروجین، تینوں زبانوں میں گفتگو کر سکتے ہیں۔

عورت مرد کی طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عورت اور مرد یکساں طور پر گھر، اولاد اور دعوت دین کے لئے کام کریں۔ موجودہ زمانے میں ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ گھر عورت کے لئے بنیادی اور اہم ذمہ داری ہے لیکن جاہل عورت کوئی کام بھی صحیح طرح نہیں کر سکتی۔ بچوں کی تربیت کے لئے زندگی اور معاشرے کے تجربات اور مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں بچوں کی تعلیم وتربیت اور والدین کی خدمت کرنا ممکن ہوتا ہے۔ ہمارا موجودہ تربیتی نظام خواتین کو مربی اور داعی بنانے کے بجائے انہیں ناکارہ اور پس ماندہ بناتا ہے۔ حالانکہ وہ آنے والی نسلوں کی تربیت کی ذمہ دار ہیں۔

میں نے قرآن کا اسکنڈی نیوین زبان میں ترجمہ شروع کیا ہے۔ اس کے علاوہ فریضہ حج ادا کرنے کی میری نیت ہے اور میں صحابیات کی تقلید کرتے ہوئے مسلمان عورت کی مدد کرنا چاہتی ہوں، تاکہ وہ اپنا فریضہ منصبی فعال طور پر ادا کرے۔ اللہ میری مدد فرمائے اور ہماری کوششوں کو اپنی رضا کے لئے خاص کر دے۔ آمین!

سویڈن میں مختلف قوموں کی مسلمان خواتین رہتی ہیں، جن کا تعلق یورپ، ایشیا، افریقہ، امریکہ اور عرب ممالک سے ہے۔ ہم نے خواتین کی خدمت اور دعوت اسلامی کے کام میں تمام مسلمان خواتین کو شریک کرنے کے لئے متحدہ پلیٹ فارم کی ضرورت محسوس کی، تاکہ اس تنظیم کے ذریعے خواتین آسانی سے ہمارے ساتھ رابطہ کر سکیں۔

خواتین لڑکیوں اور بچوں کے لئے ہفتہ وار عربی اور سویڈش زبان میں درس ہوتے ہیں۔ عورت کے مسائل اور ضروریات سے متعلق سیمینار اور ورک شاپس منعقد ہوتی ہیں۔ تربیتی کیمپ اور سالانہ کانفرنس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ عورت کے مسائل، مشکلات اور اس کے حقوق کے دفاع کے لئے کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ضرورت مند اور پناہ گزینوں کے لئے ہم فنڈز جمع کرتے ہیں۔

ہماری سرگرمیوں کے نتیجے میں پروگراموں کی نوعیت اور خواتین کی ضرورت کے مطابق اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بوسنیا اور یورپ کی خواتین قرآن وحدیث کی تعلیمات سیکھنے میں دلچسپی لیتی ہیں جبکہ صومالی خواتین کی کوشش عربی سیکھنے کے

لئے ہوتی ہے۔ میرے خیال میں میاں بیوی کی تعلیمی قابلیت اور مقام ان کے رجحان کی سمت متعین کرتا ہے۔ لیکن ہماری مسلسل کوشش ہوتی ہے کہ ہم عورت کی مکمل مدد کریں، تاکہ وہ دین کے مطلوبہ مقام تک پہنچ جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کام کے لئے بڑے صبر وضبط کی ضرورت ہے۔

عورت کی آزادی کا نعرہ خرافات اور جہالت پر مبنی ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ ہم خواتین کو یہ باور کرائیں کہ اسلامی اصولوں کے اندر رہتے ہوئے معاشرے کی تعمیر وترقی میں عورت کا کیا کردار ہے۔ لیکن عورت کو اس اخلاقی دائرے سے باہر لاکر آزادی کی بات کرنا کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں کے لئے بیچے یا اپنی اولاد کو مامتا کی محبت سے محروم کرکے انہیں خادموں کے حوالے کرے اور خود دوسروں کی خدمت کرے یہ ہمیں ہرگز منظور نہیں ہے۔ عورت کے لئے ضروری ہے کہ اپنی عصمت کی حفاظت کرتی رہے۔ اس طرح فطری امنگوں کی تکمیل ہوتی ہے اور خاندان کے افراد میں محبت اور الفت پنپتی ہے اور پورے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔

تسلیمہ نسرین کی سویڈن آمد پر میں نے سویڈن ٹی وی پر تبصرہ کیا تھا۔ تسلیمہ نسرین کا کوئی علمی مقام نہیں ہے۔ اس نے سیاسی پناہ اور سستی شہرت کے حصول کے لئے مغرب کو استعمال کیا ہے، حالانکہ وہ اپنے مخالفین اور حامیوں دونوں کی طرف سے اس قسم کے اہتمام کی ہرگز مستحق نہیں تھی۔ قرآن پاک اس زمانے کا معجزہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس طرح کے لوگوں کو اہمیت نہ دیں۔ اور انہیں آزادی اظہار کے ہیرو نہ بنائیں۔ قرآن تو اس لیے آیا ہے کہ وہ غلاموں کو آزادی کی نعمت سے سرفراز کرے، لیکن مسلمانوں کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے کہ قرآن پاک کو آزادی رائے کے نظریے کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ دلیل کا جواب دلیل سے دیا جانا چاہیے نہ کہ جذبات اور اشتعال کا اظہار کیا جائے۔

مجھے پہلے پاکستان، سوڈان اور الجزائر میں خواتین کانفرنس میں شرکت کی دعوت ملی، اس کے علاوہ میں نے تین بین الاقوامی کانفرنسوں عمان، لاہور اور استنبول میں شرکت کی ہے۔ الجزائر میں منعقد ہونے والی خواتین کانفرنس مجھے پسند آئی، جس میں معروف داعیہ زینب الغزالی اور اردن سے سمیرہ نے شرکت کی۔ یہ میری تمنا ہے کہ کارکنان کی فعالیت اور ان کی سرگرمیوں کو مربوط اور فعال بنانے کے لئے خواتین کانفرنسوں کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے، کیونکہ ان کی سرگرمیوں کی موجودہ صورت حال بہت ناتواں ہے اور میرے خیال میں یہ داعی حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی خواتین اور بیٹیوں کو اس میدان میں جلد کام کرنے کی ترغیب دیں، تاکہ وہ اسلامی دعوت وتبلیغ کا کام کاس طرح انجام دیں، جس طرح وہ اپنی دیگر ضروریات اور مسائل کے لئے کرتی ہیں۔

مجھے عمرہ ادا کرنے سے بہت سکون حاصل ہوا۔ میں مکہ اور مدینہ بار بار جانا چاہتی ہوں۔ جدہ شہر کی ترقی اور جدت پسند آئی، جبکہ اردن میں معاشرتی زندگی اور بالخصوص خواتین کی صورت حال دیگر اسلامی ممالک کی نسبت قابل اطمینان ہے جہاں

عورت معاشرے میں اپنا حقیقی کردار ادا کر رہی ہے۔ عمان ایک خوب صورت شہر ہے، خصوصاً موسم بہار اور گرمیوں کے شروع میں ہر شہر کی اپنی خصوصیات ہیں۔ جبکہ مصر کے لوگ مشکل زندگی اور غربت کے باوجود بڑے صابر اور قانع ہیں۔ مراکش کی صورت حال بھی دیگر شہروں سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے قدرتی مناظر قابل ذکر ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ممالک میں دین بس روایات اور رسم ورواج کا نام ہے، ماسوا اس کے کہ نوجوانوں میں اسلامی احیا اور معمول کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں۔ میں نے یہ دورہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہی کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے یہ کام پہلے نہیں کیا تھا، کیونکہ اگر میں عرب اور اسلامی ممالک کا دورہ اس سے قبل کر لیتی تو شاید پھر میں دین پر اتنی سختی سے کاربند رہنے والی نہ بن سکتی، کیونکہ مطالعے کے دوران کتابوں میں میں نے اسلامی افکار، عقیدے اور ثقافت وتمدن کی جو حسین صورت دیکھی تھی، وہ ان ممالک کے لوگوں کی زندگیوں میں مفقود نظر آئی، بلکہ بعض ایسے مناظر بھی دیکھنے میں آئے، جو بالکل اسلامی روح کے خلاف تھے۔

(سوئے حرم، مئی 2012)

☆☆☆

شہناز یونس

قدرت کا انمول تحفہ

پھلیاں

پھلیاں جسم میں بننے والے تباہ کن مادوں کے اثر کو زائل کرتی ہیں

لوبیا سرخ یا سفید چھوٹا یا بڑا ایک غذائیت سے بھرپور ہیرا ہے جسے ہم اپنی زندگیوں میں اہمیت نہیں دیتے جو دینی چاہیے۔شاید بہت سے لوگوں کو اس کی غذائی اہمیت کا اندازہ نہیں۔غذائی ماہرین کے مطابق آدھ کپ لوبیا اپنے اندر اتنی پروٹین رکھتا ہے جتنی ۲ اونس بکرے کا گوشت۔

بہت ساری لوبیا کی اقسام ریشہ(Fiber)، وٹامن بی، معدنیات جس میں کیلشم اور میگنیشم شامل ہیں کا خزانہ رکھتے ہیں۔ایک اور چیز جو ہمارے لئے بہت ضروری ہے وہ ہیں اینٹی آکسی ڈینٹس (anti-oxidants) یہ وہ مادے ہیں جو ہمارے جسم میں بننے والے Free radicls کے اثر کو زائل کردیتے ہیں۔

تھوڑا سا آپ کو قریradicals کے بارے میں آگاہ کرنا چاہوں گی۔ ہماری نارمل زندگی میں جتنی طاقت ہمیں چاہیے ہوتی ہے وہ ہماری خوراک سے بنتی ہے۔ یہ طاقت ہمیں زندگی کے ہر کام کرنے کیلئے چاہیے ہوتی ہے۔جب یہ انرجی جسم میں رہتی ہے اس کے نتیجے میں کچھ اور مادے بھی جسم میں بنتے ہیں جو کہ خون میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان کو فریradicals کہتے ہیں۔ ان کا جسم میں موجود ہونا ہمارے جسم کے لئے فائدہ مند نہیں۔کیونکہ یہ خلیوں کے لئے زہر قاتل ہوتے ہیں۔کبھی یہ خلیے کے اندر کے حصوں کو تباہ کرتے ہیں کبھی خلیوں کی دیوار کو تباہ کرتے ہیں۔

قدرت نے ہماری خوراک میں کچھ ایسے مادے رکھے ہیں جن کے کھانے سے جسم میں anti-oxidants بنتے ہیں۔ یہ انتہائی ضروری مادے ہیں کیونکہ یہ Free radicals کے اثر کو زائل کرتے ہیں۔ وہ خوراک جس میں یہ مادے ہوتے ہیں ان میں لوبیا بھی شامل ہے جس کو ہم اپنی خوراک میں وہ درجہ نہیں دیتے جو دینا چاہے۔لوبیا چاہیے کسی بھی رنگ اور شکل کا ہو، چاہے تازہ سبز رنگ کا پھلیوں کی شکل میں ہو anti-oxidants سے بھرپور ہوتا ہے۔

پاکستان میں ماشا اللہ بہت سی اقسام کا لوبیا پایا جاتا ہے۔ تازہ پھلیوں میں فرنچ beans، چائنیز beans گوارے کی پھلی، سفید چھوٹا لوبیا، سرخ لوبیا، کالا لوبیا پایا جاتا ہے اور کوئی بھی دو قسم کے لوبیا ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر ایک میں اپنی ایک علیحدہ غذائی قوت ہوتی ہے۔سب سے سستا لوبیا بھی قیمتی پروٹین سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔

لوبیا ذیابیطیس کا دشمن

لوبیا ہمارے جسم میں بننے والی خون کی شکر کو کنٹرول

کرتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوبیے میں موجود ریشہ(Fiber) ہاضمے کے عمل کو آہستہ کرتا ہے جو شکر کو خون میں جذب کرنے کے عمل کو سست کرتا ہے جس کے نتیجے میں لوبیا کھانے والے لوگوں میں خون میں شکر کا ایک متعدل درجہ رہتا ہے جو کہ ذیابیطیس کو روکنے میں مدد دیتا ہے مغربی ممالک میں چونکہ ریسرچ بہت ہوتی ہے اور لوگ اپنی بیماریوں کے بارے میں فکرمند بھی بہت ہوتے ہیں۔کینیڈا میں کچھ سال پہلے لوگوں کی ایک خاصی تعداد پر ریسرچ کی گئی تو پتہ چلا کہ لوبیا کھانے والے لوگوں میں شکر کی ایک معتدل سطح رہی ان لوگوں کے مقابلے میں جو پھلیاں یا لوبیا نہ کھاتے تھے۔لوبیا کھانے والوں میں موٹاپے کا رجحان بھی ان لوگوں کے مقابلے میں جو لوبیا نہیں کھاتے کافی کم ہوجاتا ہے۔لوبیایا پھلیاں ہمارے جسم میں زہریلے مادے بننے کے عمل کو اور سوجن کے عمل کو روکتی ہیں۔

لوبیا اور پھلیاں دوطرح کے ریشے پیدا کرتے ہیں ایک حل ہونے والے جو پانی میں حل ہوکر جیلی کی طرح کا ایک مادہ بناتے ہیں (یہ تجربہ آپ گھر میں بھی کرسکتے ہیں)جو خون میں کولیسٹرول اور گلوکوز کے لیول کو کم رکھتا ہے۔دوسری طرح کے ریشے جو حل نہیں ہوتے وہ نظام انہضام میں ایسے ہی گزر جاتے ہیں اور زہریلے مادوں کو جسم میں بننے ہی نہیں دیتے اور جسم سے خارج ہوتے وقت اپنے ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔

لوبیا کولیسٹرول کو نارمل حد میں رکھنے میں مدد دیتا ہے کیونکہ اس میں موجود ریشہ پانی کولیسٹرول اور زائد شکر کو جذب کرلیتا ہے جو کہ دل کی صحت کے لئے ایک مہمیز کا کام کرتا ہے۔

اگر لوبیا اتنے اعلیٰ اور عمدہ ہیں تو ہم ان کو اکثر کیوں نہیں کھاتے؟

اکثر لوگوں کے پھلیوں کو نہ کھانے کی وجہ ان کا دیر سے ہضم ہونا ہے لیکن اگر آپ ان کو شروع شروع میں کم مقدار میں اپنی خوراک میں شامل کرنا شروع کریں جیسے آدھی مٹھی لوبیا ابال کر سلاد میں ڈال لیں اور آہستہ آہستہ اس کی مقدار اپنی خوراک میں بڑھائیں لیکن آدھ کپ لوبیا ایک شخص کیلئے کافی ہے جب ہمارا جسم اس ریشے سے مانوس ہوجائے گا اور ہماری آنتوں کی صفائی بھی ہوتی رہے گی اور گیس سے پیدا شدہ تکالیف بھی آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے ختم ہوجائیں گی تو ہم اس کو زیادہ رغبت سے کھانا شروع کردیں گے۔ اکثر ہم چنا چاٹ بناتے ہیں یا آلو چھولے بناتے ہیں۔آپ سفید چنوں کی بجائے سفید لوبیا یا سرخ لوبیا چاٹ میں استعمال کریں آپ اس چاٹ سے زیادہ لطف اندوز ہونگی۔

اچھا کھائیں کم کھائیں اور صحت مند رہیں۔

☆☆☆

خالی دامن

''تمہارا کیا خیال ہے،کل کی دعوت کے بارے میں؟''فرح نے اپنی بہن صبا سے پوچھا۔

''توبہ ہے! کل تو اتنا بدمزہ کھانا بنایا تھا بھابھی نے میں تو کھائے بغیر ہی آ گئی۔''صبا نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''ہاں میں بھی یہی کہہ رہی تھی۔''فرح نے پرجوش ہو کر کہا پھر ان دونوں خواتین نے اپنی بھابھی کے بارے میں اس کے ہاں کھائے ہوئے کھانے کے مابعد اثرات یہ بحث شروع کی لیکن دونوں نے محسوس ہی نہ کیا کہ وہ بھابھی کا''مردہ جسم''نوچ نوچ کر کھانے میں کچھ بھی کراہت محسوس نہیں کر رہی ہیں۔ بھابھی اور اس کے کھانے کی ہر ڈش میں کوئی نہ کوئی خرابی کا احساس اتنا مستحکم تھا کہ بھابھی کی کوئی بھی خوبی احساس کی گرفت سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ جب''مردار''کھانے کی عادت پختہ ہو جاتی ہے تو ہر چیز میں اس مردار خوری کا ذائقہ ہی چٹخارے دار معلوم ہوتا ہے۔

ایک اور منظر میں لین دین پر دل کے ارادے ظاہر ہو رہے ہیں''سارہ! میری ساس چاہتی ہے کہ میں اپنے زیور میں سے کوئی چیز اپنی نند کو تحفہ دے دوں''اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا اپنی دوست کو دیکھا اور پرعزم لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔''میں تو مر کر بھی اس کمینی کو اپنی کوئی چیز نہ دوں چاہے وہ ٹوٹی جوتی ہی کیوں نہ ہو۔''

اور پھر ٹوٹی جوتی بھی نہ دینے کا عزم کرنے والی نے اپنی نند کو اپنے بہت سے نیک اعمال منتقل کر دیئے۔ وہ جتنی برائی، بدزبانی، مغلظات، الزام لگا سکتی تھی اس پر لگائے۔ اس کو محسوس بھی نہ ہوا، یاد بھی نہ رہا کہ وہ اپنی کتنی قیمتی عبادات اپنے اعمال نامے سے نند کے اعمال نامے میں منتقل کرتی جا رہی ہے۔ وہاں وہ اپنی نند کو راضی کرنے کے لئے ہر قیمتی چیز دینے کو تیار ہو گی۔ مگر وہاں تو ہاتھ بھی خالی ہو گا اور دامن بھی۔ ساری نیکیاں اپنے وہ متعلقین لے گئے ہوں گے جن سے دشمنی تھی۔ جس کو کبھی کچھ نہ دیا سوائے دل دکھانے کے۔ زبان کی تیزی، بدلحاظی اور بے مروتی کے اس شاخسانے کا ادراک آج نہ ہوا تو پھر کب ہو گا؟

انسان سمجھتا ہے وہ اپنے دشمن سے بدلہ لے رہا ہے۔ جس سے دل راضی نہیں اس کو محروم کر رہا ہے۔ دل کی بھڑاس نکال رہا ہے۔ مگر کتنا نادان ہے کہ جس کو معمول ساحق دینے پر دل تنگ ہے۔ اسی کو بن مانگے''جواہرات''دے کر تہی دامن ہوتا جا رہا ہے۔ یہ دشمنی تو اپنے آپ سے ہے۔ واقعی انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے۔ وہ دوسروں پہ نہیں اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہے۔

اپنی جان پر ظلم کا چلن کیسے ختم ہو؟ اپنی کمائی، اپنی اخروی دھن، دولت کی حفاظت کیسے ہو؟

انسان کے لئے اپنے تمام حواس اور بدن کے اعضاء میں زبان کی اہمیت جتنی زیادہ ہے اس کی حفاظت اتنی ہی اہم ہے اور کمزور انسان کے لئے اس کے ساتھ درست اور ایمانی رویہ رکھنا بھی اتنا ہی مشکل ہے۔ مشکل امر پہ کامیابی کی ضمانت بھی زیادہ ہے۔ جنت کی ضمانت کے لئے دو اعضاء کی حفاظت کرنے کا ایک ساتھ حکم دیا گیا، عزت وعصمت، آبرو کی حفاظت کرنے والے کے لئے جنت کی ضمانت ہے تو زبان کی حفاظت کا وعدہ کرنے والے کے لئے بھی اس کے ساتھ، اسی محفل میں جنت کی ضمانت دی گئی ہے۔ ایک لحاظ سے زبان کی حفاظت اور بھی مشکل امر ہے۔ کہ اس کے مواقع وافر ہیں۔ فون، انٹرنیٹ، موبائل نے یہ کام اور بھی آسان کر دیا ہے اور معاشرے میں ہر طرف مردار خوری کا چلن عام ہو گیا ہے۔ ہر طرف ایک عجیب سی سڑانڈ اور بساند ہے جس سے ایمانی رویہ بھی کمھلا گیا ہے۔ تازگی کی جگہ پژمردگی نے لے لی ہے۔

آیئے اپنے آپ کو ظلم سے بچائیں، خود پہ مہربان ہو جائیں۔ اپنی دولت کی حفاظت کریں۔ معاشرے میں حسن پیدا کریں۔

☆۔ سب سے پہلے نیت میں اخلاص پیدا کریں۔ اللہ تعالیٰ سے استقامت کی دعا کریں۔

☆۔ استغفار کریں۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کو پردے میں رکھنے کی استدعا کریں۔ پھر توبہ کریں کہ آئندہ اس گناہ سے بچنے کے عملی اقدامات کروں گی۔ خالی استغفار کی تسبیح پڑھ لینے سے کام ادھورا رہتا ہے جب تک انابت وتوبہ کے ذریعے عملی اقدام کر کے نہ دکھایا جائے۔

☆۔ جن کی برائیاں نظر آتی ہیں، ان کی اچھائیاں بھی تلاش کریں اور ان کی خوبیوں کا ان لوگوں کے سامنے اظہار کریں جن کے سامنے لوگوں کی برائیاں کی تھیں۔

☆۔ جن کی برائیاں کی ہیں، دل دکھایا ان سے معافی مانگیں، اگر وہ معاف نہ کریں تو ان کے ساتھ احسان کا رویہ رکھیں۔ اصلاح کا عمل جتنا خلوص نیت سے ہوگا اللہ تعالیٰ کی مدد بھی اسی حساب سے شامل ہوگی۔

☆۔ ان کو تحائف دیئے جائیں۔ گزشتہ برے سلوک کی تلافی کے لئے حسن سلوک کیا جائے۔ ہوسکتا ہے اس کام میں اپنے حسن اخلاص نیت کا یقین دلانے میں بہت وقت لگ جائے۔ مگر صبر واستقامت سے نیکی پہ قائم رہا جائے۔

☆۔ جن کے ساتھ برے سلوک کی تلافی ممکن نہ ہو ان کے درجات بلند کرنے کی دعا کی جائے۔ اس سلسلہ میں ایک مسنون دعا بھی ہے۔ اس دعا کو ہر رات یا ہر نماز کے بعد پڑھا جائے۔ جن کو ہم نے تکلیف دی ان کو جب رب کا تقرب مل جائے گا تو وہ ہمارے خلاف دعویٰ دائر نہ کریں گے ان شاء اللہ۔ ''اے اللہ! یہ ایک عہد ہے میرے اور آپ کے درمیان، میں جانتا/ جانتی ہوں کہ آپ عہد کی پابندی کرنے والے ہیں، تو پھر عرض یہ ہے کہ اے اللہ بے شک میں ایک کمزور انسان ہوں، میں نے اسی کمزوری کے تحت کسی مومن کو تکلیف دی ہو۔ برا بھلا کہہ دیا ہو یا اس کو سزا دے دی ہو، یا اس پر لعنت کی ہو، تو میری درخواست ہے کہ اس کے بدلے میں تو اس کو رحمت، پاکی اور اپنی قربت کا

ذریعہ بنادے اپنا تقرب عطا کردے۔" (حزب الاعظم)

☆۔ جن لوگوں کو بہت زیادہ غیر محتاط باتیں کرنے کی عادت ہے، ان سے میل جول کم کردیں۔ وقت کا کوئی بہتر استعمال تلاش کریں۔

☆۔ جب کوئی کسی کی برائی کرنے لگے تو اس کو روک دیں۔ اس بات سے توجہ ہٹانے کی پوری کوشش کریں۔ کسی اور طرف دھیان لگائیں۔

☆۔ دولوگوں نے کسی تیسرے کی بات کرنی ہو تو دونوں ایک دوسرے کو پہلے باور کرائیں کہ ہم نے برائی نہیں کرنی ہے الا یہ کہ شرعی احکامات کے مطابق ہو۔ جب ہم کسی نیک کام کا ارادہ لوگوں پر ظاہر کرتے ہیں تو پھر لوگ ہمیں مکمل طور پر خامیوں سے پاک دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں وہ ایک ہی جست میں چاہتے ہیں کہ ہم برائیوں سے خود تو پاک ہوجائیں۔ یہ رویہ اکثر معاندانہ ہوتا ہے۔ مقصد یہ باور کرانا ہوتا ہے کہ اپنے گریبان میں پہلے جھانکو، ہر طریقے سے ہماری کمزوریاں گنوائی جاتی ہیں۔ انسان، انسان ہی رہے گا وہ فرشتہ نہیں بن سکتا۔ انسانی کمزوریاں ظاہر ہوتی رہیں گی، لوگوں کے منفی رویہ سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ مولانا مودودیؒ نے کتنی اچھی مثال دی کہ جب ایک برتن کو بہت سارے لوگ مانجھنے لگیں تو اس کی صفائی اس قدر زیادہ بہتر ہوجائے گی۔ اور اسی پہ میل آتے ہی صفائی ہوتی رہے گی۔

☆۔ جب کسی سے ملاقات کے لئے جانا ہو تو اللہ تعالیٰ کے حضور درخواست کریں جو کہ ایک مسنون دعا کی شکل میں ملتی ہے۔ "اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتی / آتا ہوں کہ میں کسی کو بہکاؤں یا مجھے کوئی بہکائے، خود لغزش کھاؤں یا دوسرے کو لغزش میں مبتلا کروں، کوئی ظلم مجھ پر کرے یا میں کسی پر ظلم کروں، میں کسی کے ساتھ نادانی کی بات کروں یا کوئی اور میرے ساتھ نادانی کی بات کرے۔"

☆۔ کسی کی برائی کا تذکرہ ناگزیر ہو تو اشارے کنایے میں نام لئے بغیر بات کی جائے۔ مسنون طریقہ بھی یہی ہے کہ .....لوگوں کو کیا ہوگیا ہے.....آج کل لوگ یہ کہنے لگے ہیں یا سوچنے لگے ہیں۔ یعنی بات کرنے کا طریقہ ایسا ہو کہ کسی خاص شخص کی طرف نام کا تذکرہ نہ ہو، دھیان نہ جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعمال صالحہ کرنے اور ان کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

☆☆☆

سر تسلیم خم ہے!

بتول میگزین

سرِتسلیم خم ہے!

فریدہ خالد۔کراچی

سورۃ نحل پڑھتے ہوئے دل میں شدید خواہش جاگی کہ کاش میں بھی شہد کی مکھی ہوتی۔ اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقے پر/راستوں پر چلتی رہتی اور آخرت کے عذاب سے بچ جاتی۔مگر میں تو انسان ہوں اور میرے لئے یہ دنیا گویا ؎

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

مگر آج سورۃ النور کی آیت نمبر ۳۵ پڑھ کر دل میں شکر گزاری کا ایک عجیب احساس جاگا کہ اللہ تعالیٰ جو اس ساری کائنات کا مالک ہے۔اس نے صرف اور صرف مجھے (یعنی انسان) کو اپنی تمام مخلوقات میں سب سے افضل بنایا اور میری ہدایت کا سامان اپنے نور سے کیا۔

میری رہنمائی کیلئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام بھیجے۔اپنے آخری نبی محمد ﷺ کو بھیج کر مجھ پر احسانِ عظیم کیا۔ آپؐ پر اپنی آخری کتاب نازل کی۔میرے نبیؐ نے اس کتاب (قرآن) کے ہر حکم پر عمل کر کے میرے لئے عملی نمونہ چھوڑا۔میں جو کل تک فرشتوں کی قسمت پر ناز کرتی تھی آج خوش ہوں اپنے انسان ہونے پر کیونکہ ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور اسکی اس رہنمائی پر میرا دل پکار اٹھا، میں حاضر ہوں میرے اللہ تیرے ہر حکم پر میرا سر تسلیم خم ہے۔

☆☆☆

بچوں کو مضبوط بنائیں؟

شہزادی پھول بانو۔لاہور

اللہ تعالیٰ نے یہ موسم یہ سردیاں گرمیاں کیوں بنائیں اس لئے کہ ہم زمانے کے سرد و گرم حالات سے نمٹنے کے لئے خود کو تیار کریں ہم اتنے مضبوط ہوں کہ زندگی کے گرم سرد حالات ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں ہمیں کمزور نہ کر سکیں۔

لیکن آج ہم اتنے نازک بن چکے ہیں کہ نہ گرمی برداشت کر سکتے ہیں نہ سردی۔ اسی لئے تو ہم اپنے عام حالات میں بھی اتنی جلدی گھبرا جاتے ہیں اور سب سے زیادہ ظلم تو ہم اپنی اولادوں پر کر رہے ہیں۔ A.C والی گاڑیاں A.C والے سکول۔آج ہمارے بچوں سے دو منٹ کی گرمی برداشت نہیں ہوتی تو سوچیں اللہ نہ کرے آج جو ہمارے ملک کے حالات جا رہے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے اللہ نہ کرے اگر ہماری اس نازک مزاج نسل

کو دھوپ میں کھڑا کر کے اتنا ہی کہا گیا کہ A.C میں بیٹھنا ہے تو اپنا دین چھوڑ دو، تو مجھے نہیں لگتا کہ یہ اپنے دین پر قائم رہ سکیں گے کیونکہ نہ تو ہمارا ایمان اتنا مضبوط ہے اور نہ ہمارا جسم اور نہ ہی کبھی ماؤں نے انہیں وہ واقعات سنائے کہ کس طرح بلالؓ کو کفار نے لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں ڈال دیا لڑکے انہیں مکہ کے پہاڑوں میں گھسیٹتے پھرتے۔

حضرت خبابؓ غلام تھے وہ اسلام لائے تو آقا نے لوہا گرم کے ان کے سر پر رکھ دیا۔

حضرت صہیبؓ اور حضرت عمارؓ کو کفار لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں چھوڑ دیتے لیکن دھوپ کی شدت سے ان کی حرارتِ اسلام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔

ہم نے تو اپنے بچوں کو ایسے رکھا ہوا ہے جیسے ہم فریج میں چیزیں رکھتے ہیں تاکہ وہ تازہ رہیں ہر چیز الگ الگ تاکہ یہ ایک دوسرے کی بدبو اور خوشبو سے بچے رہیں۔ اسی طرح ہم نے اپنے بچوں بنا دیا ہے بالکل الگ تھلگ الگ کمرہ A.C، کمپیوٹر، موبائل یہ بھی نہیں پتہ کہ گھر کے باقی افراد کیا کر رہے ہیں کس حال میں ہیں۔

نہ ہم اپنے بچوں کو باہر نکالتے ہیں کہ وہ بگڑ جائیں گے بدتمیز ہو جائیں گے تو آخر نکلنا تو انہیں اسی معاشرے میں ہے اگر آج اللہ نے بے شمار سہولیات دے رکھی ہیں تو ضروری نہیں کہ کل بھی ایسا ہی ہو۔ دکھ بھی آتے ہیں سکھ بھی آتے ہیں۔

خیر بات ہو رہی تھی بچوں کی، تو جو گلی کے بچے ہیں انہیں کون سنوارے گا ایک پودا لگانے اسے بڑا کرنے کے لئے اس کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے جھاڑ جھنکار صاف کرنا پڑتا ہے تب ہی وہ پودا پروان چڑھتا ہے تو جو محلے کے بچے ہیں ان کی اصلاح بھی تو ہمارے ہی ذمہ ہے، بجائے اس کے کہ بچوں کو گھر کی چار دیواری میں محفوظ کریں ان بچوں کی تربیت کر کے ان کو گھر سے باہر نکالیں ان بچوں میں احساس ذمہ داری پیدا کریں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع دیں۔ کھیل کھیل میں وہ دوسرے بچوں کی اصلاح کریں۔

میرا پیغام ہے کہ اپنے بچوں کو کبھی سینڈوچ میکرز میں بھی رکھیں۔ کیسے اوپر نیچے سلائس رکھ کے اور درمیان میں مصالحہ جات ڈال کر انہیں بند کر دیا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی سلائس کی اپنی ایک حیثیت برقرار رہتی ہے۔ ایسا بنائیں خود کو اور اپنے بچوں کو۔ ان میں احساس پیدا کریں بے حسی پیدا نہ کریں۔ انہیں مضبوط قوت ارادی والا بنائیں کمزور نہ کریں۔

پڑھائی اور اسٹائل

لبنیٰ اشفاق۔ کراچی

وہ بڑے انہماک کے ساتھ اپنا ہوم ورک کرنے میں مصروف تھا اسے میں بڑے پیار سے دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ ''میرا بھائی کتنا محنتی ہے۔'' کہ اچانک اسکے موبائل نے sms کی بیل دی اس نے دیکھا، جواب لکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ایک بار پھر یہی عمل دہرایا اور پھر اپنے کام کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بڑی دلچسپی کے ساتھ اسے

دیکھ رہی تھی وہ پڑھنا چاہتا تھا لیکن موبائل پر آنے والے smsاور callsاسے مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھیں کچھ دیر بعد اس نے اکتا کر موبائل پر میوزک لگا لیا اور کام کرنے لگا۔ مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا اس وقت لگا جب دیکھا کہ وہ mathsکے سوالات حل کر رہا ہے۔ میوزک سے لطف اندوز ہو کر اپنا سر دھنتا جا رہا ہے اور گانے کے بول دہرا کر انجوائے کرتے ہوئے بڑی مہارت کے ساتھ سوال حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بھی تمام تر مصروفیات کو ترک کرتے ہوئے اسے دیکھتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ پھر تھوڑی دیر پہلے انتہائی توجہ کے ساتھ پڑھنے والا طالبعلم کچھ الجھن کا شکار ہوا اور قلم بند کر کے کتاب ایک جانب رکھتے ہوئے پڑھائی مؤخر کرنے کا ارادہ تھا۔ میں نے سوال کیا ''کیوں ہوگئی پڑھائی؟''

تو بولا ''جواب پتہ نہیں کیوں نہیں آ رہا، اب کل پڑھیں گے۔''

ہمارے ہاں بچوں کے پڑھنے کا انداز تقریباً ایسا ہی ہے۔ چند دن قبل اسی موبائل کی برکت سے والدہ کو غلط ڈرپ لگتے رہنے سے رک گئی کہ بروقت تدارک کر دیا گیا۔ ڈاکٹر حضرات تک اسی وجہ سے نسخے غلط لکھنے لگے ہیں۔ اس کا تجربہ ہر چھوٹے اور بڑے سے بڑے ہسپتال میں کیا جا چکا ہے۔ بہرحال بات ہو رہی تھی تعلیمی عمل میں رخنہ ڈالنے کی۔ یاد کریں ہمارے اسلاف نے تعلیم کیلئے جو کوششیں کیں، جو دور دراز سفر کیے، جو بھی صعوبتیں برداشت کیں، وہ تاریخ کی کتب میں آج بھی سنہرے حروف سے لکھی ہوئی ہیں۔ جب علم حاصل کرنے کیلئے انتہائی شوق اور ذمے داری کا مظاہرہ کیا جاتا تھا طالبعلم جب مستعدی کا مظاہرہ کرتا تو معلم بھی اپنی تمام تر توجہ اسی طرف مبذول کرتا تھا معلم کی قدر کی جاتی تھی اور جو بھی علم حاصل کیا جا رہا ہوتا اس پر عمل بھی لازم ہوتا۔ لیکن آج تعلیم کا عمل جتنا سہل اور خوشگوار بنایا جا رہا ہے اتنی ہی بے رغبتی کا عنصر طلباء میں بڑھتا جا رہا ہے جب معلم ہی کا کوئی احترام نہیں تو اس سے حاصل کی جانیوالی تعلیم کی اہمیت بھی کچھ نہیں۔ دل چاہا آج انجوائے کر لیا، دل نہ چاہا تو کل میوزک ٹائم کی نظر کر دیا۔ اس طرح کمبائن اسٹڈی ہر کالج اور یونیورسٹی میں نظر آتی ہے جب گانے لگا کر اسائمنٹ کی تیاری ناشتے اور خوش گپیوں کے درمیان ہو رہی ہوتی ہے۔ پڑھائی تو بیچ میں کہیں کہیں ہو جاتی ہے اور بس۔ والدین اور اساتذہ سے گزارش ہے کہ انتہائی احتیاط کے ساتھ طلباء کو اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ موسیقی تو حرام ہے ہی لیکن دورانِ ڈرائیو اور دوران تعلیم اس کے خطرناک ترین نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

☆☆☆

کشمکش

صبیحہ خان۔ لاہور

اس نے سوچا میری زندگی ہی کیوں دکھوں سے لبریز ہے۔ سکھ کا کوئی لمحہ کبھی آیا ہی نہیں۔ کیا خوشیاں میرے گھر کا راستہ بھول گئی ہیں؟ دماغ اس پر اٹک گیا.....دل نے چپکے سے کہا تم جذباتی ہو کیونکہ اپنے ہی بارے میں سوچتے رہتے ہو۔ دماغ نے کہا آخر کیوں.....؟ دل نے کہا دماغ کے پاس

تو محبت کا نرم گوشہ ہے ہی نہیں خودغرض جو ہے۔ اپنی اکڑ میں ہی رہتا ہے۔ دماغ نے حقارت سے ہوں کیا۔ تم تو یوں ہی کہو گے۔ کیونکہ تمہارے پاس تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میں حقیقت کی دنیا میں رہتا ہوں میری ایک سوچ ہے جو سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ اور تم تو صرف محبت کے گرویدہ ہو.....شاعروں سے دوستی ہے مصوری میں گم رہتے ہو۔

لیکن میرے پاس ان سب بے کار باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میں تو ان سب سے الگ تھلگ ہوں کیوں کہ حقیقت ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے دل اور دماغ کی بحث جاری تھی۔ اس تکرار نے اس انسان کو پریشان کردیا جوان دونوں کی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ بستر سے اٹھا، کھڑکی کا پٹ کھولا کیونکہ وہ تنگ آ گیا تھا اور باہر کی فضا سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ لیکن یہ گرمیوں کی ایک نہایت گرم اور زرد دوپہر تھی۔ سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ سڑک سنسان تھی نہ آدمی نہ آدمی زاد۔ چرند پرند اپنی پناہ گاہوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ہجر شجر، سب نڈھال موت جیسا سناٹا ہر سو، جھلسا دینے والے لُو کے تھپیڑوں نے اس کے گال تھپتھپائے.....اُس نے ایک دم سے کھڑکی بند کردی۔ دل چاہا کمرے کی معطر اور ٹھنڈی ہوا میں لوٹ آئے وہ مڑا اور کمرے کے اندر نظر دوڑائی۔ لیکن دماغ پھر بیچ میں کود پڑا اب قہقہہ لگا کر بولا۔ ''اے نادان دل یہ دھوپ تو کچھ بھی نہیں، کیا تمہیں اس گرمی اور دہکتی ہوئی آگ کا اندازہ ہے جس کا ایندھن انسان ہے وہ آگ ہر وقت دہکتی رہتی ہے کبھی تم نے اس آگ اور اپنی دائمی زندگی کے بارے میں بھی سوچا۔

کبھی نہیں، اس لئے کہ تم تو صرف محبت کے قائل ہو ایسی محبت جو نرم وگداز ہو، جو خوشبوؤں سے معطر ہو، جہاں ٹھنڈک ہو، جہاں سکون ہو، جہاں پھول کھلتے ہوں، ستارے ٹمٹماتے ہوں، دیئے جلتے ہوں اور زندگی گنگناتی ہو لیکن تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ ایک دن اعمال کو پرکھا جائے گا اور یہ زندگی جو صرف آزمائش ہے اس کا بھی امتحان ہوگا۔ بتائے ہوئے راستوں کا احتساب ہوگا اور تمہاری پوری زندگی کو ٹٹولا جائے گا جو تم دنیا میں گزاری تھی۔ اس وقت یہ دھوپ یہ تپش، یہ سناٹا تم کو یاد آئے گا اور اچھا بھی لگے گا ابھی تو یہ سب تمہیں بہت زیادہ لگ رہا ہے لیکن ازلی اور دائمی زندگی کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لئے ابھی وقت ہے دماغ سے کام لو دل کو پرے کرکے، کچھ سوچو، محبت کو حقیقت میں بدل دو، دنیاوی زندگی پر انحصار کم کردو اور اس زندگی کے بارے میں سوچو تو سہی جس کی تمازت اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔ دماغ کا تو کام یہی ہے وہ اپنے آگے پیچھے دائیں بائیں تمام راستوں پر چلتا ہے انہیں پرچل کر دائمی زندگی کی خوشیاں بھی ملتی ہیں تمام راستوں کا تعین بھی ہے۔ احکام الٰہی بھی موجود ہیں راہبر بھی آئے، راہنما بھی ہیں، تو کونسی رکاوٹ ہے جو عمل نہیں کرنے دیتی۔ یہ دل ہی ہے جو عمل پیرا نہیں ہوتا۔ حقیقت سے گریز ہے اور صرف خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ اس دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ میرا کام تو عقل دینا

ہے، سمجھانا ہے، باقی کام پھر دل کا ہے، بحث لمبی ہوتی گئی۔آخر دل نے سوچا واقعی دماغ کی بات ہے تو صحیح لیکن وہ ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ بولا ''میرے دوست !تم سمجھتے ہو کیا مجھے اپنے اللہ اور اس کے نبیؐ سے محبت نہیں ہے۔ان کی بتائی ہوئی باتیں بھی میرے لئے مشعل راہ ہیں اور کامیاب زندگی کا راز بھی ہیں۔ سبھی ان باتوں کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے دکھ، ہمارے غم، ہماری پریشانیاں اسی کی دی ہوئی تو ہیں تو کیا ہم س سے شکوہ بھی نہ کریں جبکہ وہی ہماری مشکلات کو آسان کرتا ہے اور ہم سے محبت بھی۔وہی تو رحیم وکریم ہے تو ہم اسی سے کیوں نہ مانگیں۔''

کیوں نہیں۔ضرور مانگو دماغ نے اسے سمجھایا لیکن ہر بات کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔رونا دھونا اور شکوے شکایات ہی تو محبت نہیں ہے۔میری بات غور سے سنو کیونکہ میں جذباتی نہیں ہر بات بڑے غور وفکر کے بعد کرتا ہوں۔تم بھی ان باتوں پر دل سے عمل کروگے تو دیکھوگے کہ وہ کتاب جو ہمیں دی گئی ہے ہمارے لئے مشعل راہ ہے اس میں پوری زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔بس اسے کھولنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے چھوٹی سے چھوٹی بات کتنی سبق آموز ہے صرف یہ آیت ہی ہماری پوری زندگی کی احاطہ کئے ہوئے ہے(ترجمہ)''میرے اللہ مجھے دوزخ کی آگ سے بچا'' یہ دعا تم ہر وقت کرتے رہو تو اس کا وعدہ ہے کہ وہ تم کو معاف کردے گا تمہارا رونا دھونا اور شکوہ شکایت تو اس دنیا کی بیماریاں نہیں لیکن ان سب بیماریوں کا علاج اس آیت میں پوشیدہ ہے یہ سن کر دل نے سوچا واقعی ٹھیک تو ہے۔ یوں پہلی مرتبہ دل نے دماغ کی عقلمندی کی داد دی۔

☆☆☆

ماں کی فکر

کوثر یعقوب۔دھران

میں نے سنی جب یہ بات کہ
کہا رب نے موسیٰؑ سے سنبھل
کہ اب تیرے لئے دعا کرنے والی ماں نہ رہی
میں نے سوچا اور ڈری تھوڑا سا
پھر میں مسکرائی اور
رب سے دعا یہ مانگی
میں تو اک ماں ہوں اور
تو، تو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا
کہ میں نہ رہوں تو اے میرے رب
تو میرے بچوں اور آنے والی نسلوں کے لئے
میری دعاؤں کا حصار بن
شیطان کی راہ سے انہیں بچا کر
ایمان کی راہ پر چلانا
ہر برائی سے انہیں بچا کر
اپنی پناہ میں لے لینا
آگ سے ہمیں بچا کر
اپنی ٹھنڈی چھاؤں میں لے لینا
میں تو اک ماں ہوں
میں نے انہیں تیرے حوالے کیا

☆☆☆